بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُسوۂ رہبرِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت مولانا ابو عمار
زاهد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : اسوۂ رہبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف : مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

مرتب : ناصر الدین خان عامر

مجموعہ : مارچ ۲۰۲۴ء

ناشر :

اشاعت :

﴿فہرست﴾

☆ پیش لفظ 11

☆ عرضِ مؤلف 13

☆ رائے عامہ کا لحاظ اور اسوۂ نبوی ﷺ 14

- بیت اللہ کی نئی تعمیر کا معاملہ 14
- رئیس المنافقین کی شرانگیزی 16

☆ عبادات و معاملات میں توازن اور اسوۂ نبوی ﷺ 17

- حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا جوانی میں معمول 17
- نبی اکرمؐ کی نصیحت 18
- حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی بڑھاپے میں فکر 19
- خالق کا نظام ہی مؤثر اور دیرپا ہے 19

☆ قوموں کی اچھی خصلتیں، رسول اکرم ﷺ کی نظر میں 21

- تربیت و اصلاح کی ضرورت 21
- بنوازد قبیلہ کا وفد حضورؐ کی خدمت میں 22
- اسلامی عقائد 22
- اسلامی عبادات 22
- اسلامی مزاج و معاشرت 23
- دُنیوی و اُخروی زندگی کا اسلامی تصور 23

☆ رسول اکرم ﷺ کا پیغام دنیا کے حکمرانوں کے نام..................................25
- حضرت ابوسفیانؓ اور قیصرِ روم کا واقعہ...25
  - o قاصدِ رسولؐ حضرت دحیہ کلبیؓ قیصرِ روم کے دربار میں......................25
  - o نبی کریمؐ کا تعارف..26
  - o قیصرِ روم کا تبصرہ..27
  - o نبی کریمؐ کا مکتوب قیصرِ روم کے نام.....................................28
  - o قیصرِ روم کی پریشانی اور جستجو..29
  - o قیصرِ روم کے درباریوں کا ردِعمل..29
- سچ اور اقتدار کی کشمکش...30

☆ مشکلات و مصائب میں اسوۂ نبوی ﷺ..32
- طالبان کی مشکلات اور شعبِ ابی طالب..32
- مصائب و مشکلات میں اسلام کا مزاج...33
  - o ہجرتِ مدینہ، سراقہ، کسریٰ کے کنگن...33
- غزوۂ خندق کی تیاری..35
  - o خوف و بھوک کی ظاہری کیفیت...35
  - o نبی کریمؐ کی پیشگوئی..36
- ہجرتِ مدینہ کا پُرخطر سفر..37
- غزوۂ خندق کی مشکلات..38
- جنگِ موتہ کی شکست اور حضرت خالد بن ولیدؓ....................................38
- دینی جدوجہد کیلئے سنتِ نبویؐ سے راہنمائی.......................................39

☆ سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم........40
• جہاد کا لغوی و خصوصی مفہوم........40
• عقیدہ و مذہب کی بالادستی کیلئے ہتھیار اٹھانے کی روایت........41
• اسلام میں جہاد کی مقصدیّت........42
• جنگی ہتھیار اور تباہی آج کے دور میں........43
• فکر و فلسفہ کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھانے کا جواز........43
• جہاد کی عملی صورتیں........45
o بنی اسرائیل کا جہاد........45
o اسلامی غزوات........46
• جہاد کے حوالے سے دو سوالات کا جائزہ........48
o مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیاں........48
o اعلانِ جہاد کیلئے اسلامی حکومت کا وجود........48
• مسلمانوں کی مغلوبیت کا دور........50
• آج کے دور میں جہاد کا مفہوم........51
☆ اتحادِ اُمت، اُسوۂ نبوی ﷺ کی روشنی میں........53
• اتحاد کا مطلب اور اس کے تقاضے........53
o اختلاف اور تفرقہ کا فرق........54
o حضرت عمرؓ کے دو واقعات........54
o اختلاف کی حدود کا تعیّن........56
• وحدتِ اُمت کے لیے آنحضرتؐ کے ارشادات........58
o جاہلی روایات کا خاتمہ........58

o امت کیلئے دعائیں اور پیشگوئیاں.......... 59
• توہینِ رسالت کے خاکے اور امتِ مسلمہ کا اجتماعی ردِعمل.......... 60
☆ خصائل نبوی ﷺ احادیث نبویؐ کی روشنی میں.......... 61
• حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذوق.......... 61
• نبی اکرمؐ کے پسندیدہ خصائل.......... 63
☆ علاج معالجہ اور اسوۂ نبوی ﷺ.......... 66
☆ نبی اکرم ﷺ کا معاشرتی رویہ اور روزمرّہ معمولات.......... 69
• گھریلو مجلس.......... 69
• عمومی مجالس.......... 70
• معاشرتی طرزعمل.......... 71
• متوازن زندگی.......... 72
☆ نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی.......... 73
• خطوط، معاہدات اور مکالمات.......... 73
• خارجہ پالیسی کے اہم نکات.......... 74
o عالمگیریت کا آغاز.......... 74
o دینِ فطرت کی دعوت اور حائل رکاوٹوں کا سدباب.......... 74
o اسلام قبول نہ کرنے والی اقوام کے ساتھ معاملات.......... 75
o سازشی گروہوں کے حوالے سے حکمتِ عملی.......... 76
o بین الاقوامی چیلنجز کا سامنا.......... 76
o ابلاغ کی جنگ.......... 77
o عسکری طاقت کا حصول.......... 77

☆ امتِ مسلمہ کی صورتحال اور اسوۂ نبوی ﷺ 79
• جاہلی اقدار کی واپسی 79
• قانون کی عملداری میں امتیاز 80
• خیانت اور نااہلی کا دور دورہ 80
• سائنس و ٹیکنالوجی میں پسماندگی 81
• سرکاری حیثیت و منصب کا ناجائز استعمال 81
• سودی لین دین کا رواج 82
• اسلامی رفاہی ریاست کی عدم موجودگی 82
☆ عدلِ اجتماعی کا تصور تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں 83
• رفاہی ریاست کا آغاز 83
• اسلامی ریاست کا سالانہ بجٹ 85
☆ میڈیا کا محاذ اور اسوۂ نبوی ﷺ 87
• قریشِ مکہ کے خلاف ابلاغ کی جنگ 87
• ابلاغ کے محاذ پر آج کی ضروریات 89
☆ رسول اکرم ﷺ کی مجلسی زندگی 91
• عمومی مجلس 91
• خواص کی مجلس 91
• مجالس کا ماحول 92
☆ نعتیہ شاعری اور ادب و احترام کے تقاضے 93
• نعتیہ شاعری کی ضرورت 93
• اظہارِ جذبات میں احتیاط کی ضرورت 94

☆ تذکرۂ رسولؐ کے مقاصد اور آداب........96
• تذکرۂ رسولؐ کے مقاصد........96
• تذکرۂ رسولؐ کے آداب........96
o تخاطب کا لحاظ........97
o اسلامی عقائد کا لحاظ........98
o نسب و تعلق کا لحاظ........98
☆ تذکرۂ نبوی ﷺ کے چند آداب........99
• بزرگانِ دین کا تذکرہ، ایک دینی تقاضہ........99
• اسلام کے مسلّمہ عقائد کا لحاظ........100
• بزرگوں کا ادب واحترام........100
• انبیاء کرامؑ کے آپس میں تقابل سے گریز........101
☆ سیرتِ طیبہ اور امنِ عامہ........103
• ردعمل سے پہلے خبر کی تحقیق........103
• عوامی تاثر کا لحاظ........104
• عمومی اثرات ونتائج کا لحاظ........105
☆ رسول اکرم ﷺ بطور سیاستدان........106
• سیرتِ طیبہؐ کے سیاسی پہلو پر کام کی ضرورت........106
• اسلام کا سیاسی نظام........107
o خلافت، انبیاء کرامؑ کی نیابت........107
o قیامِ خلافت کا طریق کار........107
o فلاحی ریاست کا تصور........108

o اسلامی ریاست کے تین بنیادی اصول............108
☆ رسول اکرم ﷺ کا منافقین کے ساتھ طرزِ عمل............110
• منافقینِ مدینہ کا کردار............110
• حکمت کا جہاد............111
☆ رسول اکرم ﷺ کی معاشرتی اصلاحات............113
• وہ جاہلی اقدار جن کا نبی اکرمؐ نے خاتمہ فرمایا............113
• انسانی تاریخ کا کامیاب ترین انقلاب............115
☆ حکمتِ عملی کا جہاد............116
• منافقین کی سازشیں............116
• حکمتِ عملی کا جہاد............118
o مسلمانوں کے تعارف کا لحاظ............119
o داخلی گروہ بندی اور علیحدہ تشخص سے بچاؤ............119
☆ معاہدۂ حدیبیہ کے اہم سبق............121
• معاہدہ کی بے لچک پاسداری............121
• معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں سے براءت............122
• فریقِ مخالف کی طرف سے معاہدہ کی شق سے دستبرداری کی قبولیت............123
• معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے واپسی کا راستہ............123
☆ دفاعِ وطن اور اسوۂ نبوی ﷺ (۱)............125
• نبی اکرمؐ کے غزوات............125
• جنگی حکمتِ عملی اور رائے عامہ کا اعتماد............126
• دفاعی نقطۂ نظر سے آبادیوں کی اہمیت............126

- دشمن سے چوکنا رہنے کی ضرورت.......... 127

☆ دفاعِ وطن اور اسوۂ نبوی ﷺ (۲).......... 128

- مشترکہ دفاع کا معاہدہ.......... 128
- رائے عامہ کا اعتماد.......... 129
- ناساز حالات میں نیا محاذ کھولنے سے گریز.......... 129
- کامیاب تجربات سے استفادہ.......... 129
- میدانِ جنگ کے خودکش حملے.......... 130

☆ کفار کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا معاشرتی رویہ.......... 131

- نبوت سے پہلے کا مکی دور.......... 131
- اعلانِ نبوت کے بعد کا مکی دور.......... 131
  - آزمائش وابتلا اور معاشرتی مقاطعہ.......... 132
  - دعوت وتبلیغ کے ساتھ حمایت وحفاظت کی تلاش.......... 132
- مدینہ کا دس سالہ ہنگامہ خیز دور.......... 133
  - ریاستِ مدینہ کا قیام.......... 133
  - یہودیوں کی جلاوطنی.......... 134
  - منافقین سے سابقہ.......... 134

پیش لفظ

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے رئیس محترم ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ نے یہ مضمون ''خطباتِ راشدی'' کے پیش لفظ کے طور پر تحریر فرمایا تھا، قندِ مکرر کے طور پر اسے زیرِ نظر کتاب کا حصہ بھی بنایا جا رہا ہے۔ (راشدی)

ایک مشہور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ دین اور شریعت کا علم ہر دور میں اہلِ علم کے ایک طبقے کے ذریعے محفوظ رہے گا۔ جو اس علم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان غلط فہمیوں کی تردید بھی کرتے رہیں گے جو انتہا پسندوں اور غلو کاروں کے ذریعے پھیلیں گی، ان بے بنیاد باتوں کی تردید بھی کرتے رہیں گے جو اہلِ باطل کے ذریعے فروغ پائیں گی، اور ان غلط تعبیرات و تصورات کی اصلاح بھی کرتے رہیں گے جو دین کے جاہل اور کم علم عقیدت مند پھیلائیں گے۔ اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک مخلص اہلِ علم کی ایک تعداد ان تینوں ذمہ داریوں کو انجام دیتی چلی آ رہی ہے۔ یہ انہی بابرکت نفوس کی مبارک کوششوں کا ثمرہ ہے کہ قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ آج بھی اپنی اصل تعلیم کے ساتھ موجود ہیں۔ شریعتِ الٰہی کا روشن چہرہ آج بھی دنیا کے سامنے منور ہے۔ اکابر اسلام کے تاریخ ساز کارنامے آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہیں۔

اہلِ علم کے اسی بابرکت قافلے کے ایک قافلہ سالار حضرت مولانا زاہد الراشدی ہمارے دور میں یہی فرائض سہ گانہ انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے عرب و عجم اور مشرق و مغرب ہر جگہ اپنی فصیح اللسانی اور رواں قلم کے ذریعے اسلام کا مسلسل دفاع کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ انہوں نے دین اور شریعت کی تعلیمات پر کیے جانے والے اعتراضات کا ہمیشہ مؤثر اور مثبت جواب دیا ہے۔ باطل پرست طبقات کی طرف سے جب بھی اسلام یا اسلامی تہذیب سے کوئی غلط چیز منسوب کی گئی مولانا کے مؤثر اسلوب اور طاقتور قلم نے اس کی کمزوری کھول کھول کر عیاں کر دی۔ دین کے نادان دوستوں اور جاہل عقیدت مندوں کی کمزور تاویلات کے نتیجے میں جب بھی کسی کو دین و شریعت پر اعتراض کا

موقع ملا مولانا زاہدالراشدی نے جرأت سے کام لے کر اس موقف کی کمزوری واضح کی۔

مولانا کی یہ فاضلانہ تحریریں پاکستان اور انگلستان کے بیسیوں اخبارات اور رسائل کی فائلوں میں منتشر بلکہ مدفون ہیں۔ اخبارات کی زندگی چند گھنٹوں اور رسائل کی زندگی چند دنوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اخبارات چند گھنٹوں اور رسائل چند دنوں میں ردی کی نذر کر دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی علمی و فکری تحریروں کو محفوظ رکھنے کا کوئی مؤثر بندوبست نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ مولانا راشدی کے قلم سے نکلے ہوئے یہ جواہر پارے وقت کے ساتھ ساتھ ضائع ہو جائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ لاہور کے بعض علم دوست حضرات نے ان مضامین کی اہمیت کا احساس کیا اور ان کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کے یہ مقالات و مضامین اور تقاریر و خطبات متعدّد جلدوں میں مرتب ہو کر محفوظ ہو جائیں گے اور اہلِ علم و دانش کے لیے دستیاب ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ مولانا زاہدالراشدی کے یہ وقیع خطبات و مقالات دورِ جدید میں دعوت و تبلیغ کے نئے اسلوب کو جنم دیں گے اور ان کی مدد سے ملک کے نوجوان علماء کرام تبلیغِ دین کے ایک نئے اور منفرد ڈھنگ سے آشنا ہوں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی عمر، علم اور کوششوں میں برکت عطا فرمائے اور ان کی تحریروں اور تقریروں کو نتیجہ خیز اور مفید بنائے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
(سابق رئیس جامعہ الاسلامیہ العالمیہ اسلام آباد
و سابق وفاقی وزیر مذہبی امور پاکستان)

عرضِ مؤلف

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ
واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

گزشتہ نصف صدی کے دوران بحمد اللہ تعالیٰ سینکڑوں اجتماعات میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کی سعادت حاصل ہوئی ہے جن میں سے کچھ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ عزیزم حافظ ناصر الدین خان عامر نے ان میں سے چند مطبوعہ مضامین کو زیر نظر کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۵ء میں جامعہ الہدیٰ ٹونگھم برطانیہ میں جبکہ ۲۰۰۷ء میں دارالہدیٰ سپرنگ فیلڈ ورجینیا امریکہ میں سیرۃ النبیؐ کے مختلف پہلوؤں پر محاضرات کا موقع ملا، انہیں بھی عزیز موصوف نے قلمبند کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ وہ محاضرات مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر کے مرتب کردہ ''خطباتِ راشدی'' کی تیسری جلد میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ احباب سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیں اور مفید مشوروں سے بھی نوازیں۔

ابو عمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ
۲۴ اکتوبر ۲۰۱۶ء

رائے عامہ کا لحاظ اور اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ء)

گزشتہ ایک کالم میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا تھا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے معاملات میں، جن میں وحی کا نزول نہیں ہوتا تھا، ساتھیوں سے مشورہ کرتے تھے۔ عام لوگوں سے متعلقہ امور میں عام لوگوں کو شریک مشاورت کرتے تھے اور لوگوں کی رائے کو قبول بھی فرماتے تھے۔ آج اسی مسئلے کے ایک اور پہلو پر کچھ عرض کرنا مقصود ہے، وہ یہ کہ جناب رسول اللہؐ کو اس بات کا بھی خیال رہتا تھا کہ ان کے کسی کام سے لوگوں میں بلاوجہ غلط فہمیاں نہ پھیلیں اور پبلک تاثر درست رہے۔ عوامی زندگی میں اپنے بارے میں لوگوں کے تاثرات کو درست رکھنا اور مختلف کاموں کے بارے میں لوگوں کے احساسات وجذبات کا جائزہ لیتے رہنا اور انہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ سنتِ نبویؐ بھی ہے۔ اس بارے میں دو واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بیت اللہ کی نئی تعمیر کا معاملہ

ایک واقعہ بیت اللہ کی تعمیر کے سلسلہ میں ہے جسے امام بخاریؒ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خانہ کعبہ کی موجودہ تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ بیت اللہ کے نقشہ کے مطابق نہیں ہے۔ ابراہیمی تعمیر میں حطیم سمیت پورے بیت اللہ پر چھت تھا، دروازہ زمین کے برابر تھا، اور آمنے سامنے دو دروازے تھے جس سے عام لوگوں کو یہ سہولت ہوتی تھی کہ وہ ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے اور انہیں بیت اللہ شریف کے اندر جانے کا موقع مل جاتا تھا۔

حضورؐ کی بعثت سے پہلے جب قریش مکہ نے بیت اللہ شریف کی دوبارہ تعمیر کی تو اعلان کے مطابق حلال کی کمائی کا چندہ اس قدر جمع نہیں ہو سکا کہ پورے بیت اللہ پر چھت ڈالی جا سکے، اس لیے ایک حصہ چھت سے باہر نکال دیا گیا جو حطیم کہلاتا ہے، دو کی بجائے ایک دروازہ کر دیا گیا، اور وہ بھی زمین

کے برابر رکھنے کی بجائے اونچا کر دیا گیا جس کی وجہ آنحضرتؐ نے یہ بیان فرمائی کہ قریش کے سردار یہ چاہتے تھے کہ کعبہ کے اندر وہی شخص داخل ہو سکے جسے وہ چاہیں اور اسی مقصد کے لیے ایک دروازہ ختم کر کے دوسرا اونچا کر دیا گیا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ نے ان سے یہ تفصیل بیان فرمائی تو انہوں نے دریافت کیا کہ وہ کعبہ کو گرا کر از سرِ نو حضرت ابراہیمؑ والی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیوں نہیں کر دیتے؟ اس پر جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ان کا اپنا جی بھی چاہتا ہے لیکن چونکہ قریش والے نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں اس لیے خدشہ ہے کہ وہ اسے محسوس کریں گے، اس لیے وہ ایسا نہیں کر رہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کو پبلک تاثرات کا کس قدر لحاظ رہتا تھا۔ بعد میں جب مکہ مکرمہ پر حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی امارت قائم ہوئی تو انہوں نے حضورؐ کی خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے بیت اللہ کو گرا کر اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔ لیکن جب حضرت عبد اللہ بن زبیر شہیدؓ ہو گئے اور حجاج بن یوسفؒ نے مکہ مکرمہ کا چارج سنبھالا تو ابن زبیرؓ کا تعمیر کردہ کعبہ گرا کر اسے دوبارہ قریش کے نقشہ کے مطابق بنا دیا۔

اس کے بعد عباسی خلفاء کا دور آیا تو ان کی خواہش ہوئی کہ حجاج کی تعمیر کو گرا کر پھر سے بیت اللہ کو ابراہیمی بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ مگر اس وقت کے سب سے بڑے عالم امامِ اہلِ سنت حضرت امام مالکؒ نے یہ محسوس کیا کہ اس طرح تو بیت اللہ سیاسی گروہوں کے درمیان بازیچۂ اطفال بن جائے گا اور جو حکمران بھی آئے گا وہ پہلے کی تعمیر گرا کر اسے از سرِ نو تعمیر کرنا چاہے گا۔ چنانچہ انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ بیت اللہ شریف قیامت تک اسی نقشہ کے مطابق رہے گا اور اب اسے گرا کر نئے سرے سے بنانا جائز نہیں ہے۔ یوں انہوں نے اپنی مومنانہ فراست کے ساتھ خانہ کعبہ کو سیاسی گروہوں کی مخاصمت کا نشانہ بننے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

مگر اس واقعہ سے جو بات ہم عرض کرنا چاہتے تھے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کے احساسات و تاثرات کا اس حد تک خیال رکھا ہے کہ ایک کام کی خواہش کے باوجود اسے محض لوگوں کے احساسات کی وجہ سے روک دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کو حضورؐ کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ تکوینی طور پر اسی صورت کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا سامان کر دیا جسے رسول اکرمؐ نے صرف لوگوں

کے احساسات و تاثرات کی وجہ سے بظاہر وقتی طور پر باقی رکھا تھا۔

رئیس المنافقین کی شرانگیزی

دوسرا واقعہ بھی صحیح بخاری میں ہے اور وہ مدینہ منورہ میں منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی کے بارے میں ہے جس کی سازش اور شرارتیں سب کے سامنے عیاں ہو چکی تھیں، اس نے

- کئی موقع پر صحابہ کرامؓ کو آپس میں لڑانے کی سازش کی،
- قریش کے خلاف آنحضرتؐ کے غزوات میں اس نے درپردہ دشمنوں کی معاونت کی،
- ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں نعوذ باللہ قذف کے جھوٹے الزام کی تشہیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا،
- اور ایک غزوہ کے موقع پر سفر کے دوران اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ شرانگیز مشورہ کیا کہ مدینہ منورہ واپس پہنچ کر وہ انصار مدینہ پر زور دیں گے کہ وہ مہاجرین پر خرچ کرنا بند کر دیں اور حضرت محمدؐ اور ان کے مہاجر ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دیں۔ اس سازش اور مذموم مشورہ کی خبر حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ایک مستقل سورت نازل کر کے دی۔

اور اس ساری صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے جب حضرت عمر بن الخطابؓ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی تاکہ وہ اس منافق کی گردن اڑا دیں تو آپؐ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اور بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس سے لوگ خواہ مخوا باتیں بنائیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے پہلے اس بات کا لحاظ رکھتے کہ اس سے عام لوگوں کا تاثر خراب نہ ہو۔

عبادات و معاملات میں توازن
اور اسوۂ نبوی ﷺ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۴ جنوری ۱۹۹۹ء)

آج کی محفل میں دورِ نبویؐ کے ایک ایسے واقعہ کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے اسلام کے معاشرتی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلامی احکام وہدایات کے اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا جوانی میں معمول

یہ واقعہ صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا ہے جو حدیثِ نبویؐ کے بڑے راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ صوفی منش بزرگ تھے، انہیں نماز، روزہ اور تعلیم و تعلّم کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور ان کا یہ معمول بن گیا تھا کہ روزانہ پابندی کے ساتھ روزہ رکھتے تھے اور رات کا بیشتر حصہ اہتمام کے ساتھ نماز و قیام میں گزارتے تھے۔ حتیٰ کہ حافظ ابن عبد البر نے ''الاستیعاب'' میں ذکر کیا ہے کہ ان کے والد محترم حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باقاعدہ شکایت کرنا پڑی۔ اس شکایت کا پس منظر بھی بعض روایات میں بڑا دلچسپ بیان ہوا ہے۔

حضرت عبداللہؓ کی شادی ہوئی اور وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ الگ گھر میں آباد ہو گئے تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے بیٹے اور بہو کا حال احوال دریافت کرنے کے لیے ان کے گھر گئے۔ بہو گھر میں موجود تھیں ان سے حال پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہر طرح خیریت ہے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کے طرزِ عمل اور سلوک کے بارے میں استفسار کیا تو اس نیک دل خاتون نے معنیٰ خیز انداز میں کہا:

"آپ کا بیٹا بہت نیک ہے۔ ساری رات مصلے پر ہوتا ہے اور سارا دن روزے سے رہتا ہے۔"

عمرو بن العاصؓ جہاندیدہ شخص تھے فوراً سمجھ گئے کہ بہو دراصل شکایت کر رہی ہے۔ چنانچہ خود کچھ کہنے کی بجائے حضورؐ کی خدمت میں شکایت پیش کر دی۔

نبی اکرمؐ کی نصیحت

اس سے آگے کا واقعہ بخاری شریف میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت عبداللہؓ کو بلایا اور اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے تصدیق کر دی کہ وہ بلا ناغہ روزہ رکھتے ہیں اور رات کا اکثر حصہ نماز و قیام میں گزارتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا:

"تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، اور تیرے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔"

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ اگرچہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے جسے جتنا زیادہ ادا کیا جائے کم ہے۔ لیکن اس سے انسان کے اپنے جسم، گھر والوں، اور ملنے ملانے والوں کے حقوق متاثر نہیں ہونے چاہئیں۔ اور انسان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان توازن قائم رکھنا چاہیے جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ وہ ہر چاند ماہ کے درمیانے تین روزے رکھ لیا کریں تو انہیں ہمیشہ کے روزوں (صوم الدھر) کا ثواب مل جائے گا۔ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ بہت کم ہیں اور میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا یہ معمول بنا لو کہ ایک دن روزہ رکھو اور دو دن نہ رکھو، اس طرح مہینے میں دس روزے ہو جایا کریں گے۔ حضرت عبداللہؓ اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہؐ میں اس سے زیادہ ہمت رکھتا ہوں۔ اس پر نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی سنت اپنا لو کہ وہ زندگی بھر ایک دن چھوڑ کر ایک روزہ رکھا کرتے تھے اور مہینے میں پندرہ روزے بن جاتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا اس پر بھی قناعت کرنے کو جی نہ چاہا اور یہ کہہ کر مزید

تقاضہ کیا کہ میں اس سے افضل روزوں کی طاقت رکھتا ہوں۔ اس پر حضورؐ نے حد بندی کر دی اور فرمایا کہ اس سے افضل کوئی روزہ نہیں ہے۔

بعض روایات کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کے بارے میں بھی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے جناب نبی اکرمؐ کی اسی نوعیت کی گفتگو ہوئی اور ان کے اصرار کے باوجود آپؐ نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ سات دن سے کم مدت میں قرآن کریم مکمل کیا کریں۔

اس طرح رسول اکرمؐ نے حکماً عبداللہ بن عمروؓ کے اوقات کے ایک حصے کو نماز اور قرآن سے فارغ کر کے انہیں اپنے جسم، بیوی، مہمانوں اور دیگر لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی بڑھاپے میں فکر

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ زندگی بھر اس معمول پر قائم رہے جو جوانی اور ہمت کے دور میں تو انہیں اپنی طاقت سے کم نظر آتا تھا لیکن جب بڑھاپے اور ضعف نے غلبہ پایا تو مشکل محسوس ہوئی۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق وہ خود بڑھاپے میں کہا کرتے تھے کہ:

"اے کاش! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا۔"

مگر اب ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ جس معمول کا وعدہ وہ خود اپنے اصرار پر جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ کر چکے تھے اسے چھوڑنے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتے تھے۔ جبکہ بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے اس معمول کو نباہنا ان کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔

خالق کا نظام ہی مؤثر اور دیرپا ہے

اس واقعہ سے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن قائم رکھنے حکم دیتا ہے، اور حقوق اللہ کی ادائیگی کی کوئی ایسی صورت قبول نہیں کرتا جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہوں، وہاں ایک اور بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ انسان جب بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے سامنے وقتی حالات ہوتے ہیں اور وہ انہی کی روشنی میں معاملات انجام دیتا ہے۔ جبکہ اسلام ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں تمام احوال وظروف کا لحاظ رکھتا ہے جو کہ بسا اوقات انسان کو عجیب محسوس ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ اس کے اول وآخر تمام احوال سے واقف ہے اس لیے

قاعدہ اور ضابطہ وہی دیرپا اور مؤثر ثابت ہوتا ہے جو انسان کا خود اپنا طے کردہ نہ ہو بلکہ اس کے ماضی اور مستقبل سے مکمل آگاہی رکھنے والے مالک و خالق کی طرف سے بیان کیا گیا ہو۔

یہی صورت انسانی اجتماعیت کے قوانین و احکام کی ہے کہ انسان جب اپنی سوسائٹی کے لیے خود قوانین وضع کرتے ہیں تو قوانین وضع کرنے والا فرد ہو یا جماعت، نمائندہ ہو یا ڈکٹیٹر، اس کے سامنے احوال و ظروف اور اسباب و محرکات سب وقتی ہوتے ہیں۔ اور وہ انہی کے دائرے میں قاعدے اور ضابطے ترتیب دیتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ بے کار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے انسانی معاشرے کے لیے وہی قوانین و احکام فطری اور دیرپا ہیں جو کائنات کے خالق و مالک نے وحی کے ذریعے بھیجے ہیں۔ کیونکہ وہ ساری نوع انسانی کی ضروریات کو خود ان سے بہتر طور پر جانتا ہے اور ان سب کے ماضی، حال اور مستقبل سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے آج تک کبھی اپنے کسی قانون کے بارے میں نہ معذرت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ کسی دور میں اس کے غیر مؤثر ہونے کی کوئی شکایت سنی گئی ہے۔

قوموں کی اچھی خصلتیں، رسول اکرم ﷺ کی نظر میں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۲مارچ ۱۹۹۹ء)

اچھی عادات و خصائل انسانی معاشرہ میں افراد اور قوموں کا زیور ہیں۔ اچھی قومیں اچھی خصلتوں اور اوصاف کے ساتھ ہی بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کا بنیادی مشن یہی رہا ہے کہ انسانوں کی اصلاح کی جائے اور افراد کے عقائد اور اخلاق و عادات کو سنوارا جائے تاکہ وہ بن سنور کر انسانی معاشرہ کی اجتماعی مشینری کے کارآمد پرزے بن سکیں۔

تربیت و اصلاح کی ضرورت

ایک بزرگ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ وسائل و اسباب کو ترقی دینا اور ان میں اضافہ کرنا بہت اچھی بات ہے کہ اس سے انسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور سہولت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ وسائل و اسباب کو استعمال کرنے والے ہاتھوں کی اصلاح کی جائے اور انہیں ان کے صحیح استعمال کا سلیقہ بخشا جائے۔ کیونکہ مشین عمدہ اور نئی ہو مگر استعمال کرنے والے ہاتھ اناڑی ہوں تو اس مشین کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ اور اگر مشین پرانی اور کمزور ہو مگر استعمال کرنے والا کاریگر تجربہ کار اور اہل ہے تو وہ اسے کسی نہ کسی طرح استعمال میں لے ہی آئے گا۔

اس لیے صوفیاء کرامؒ سب سے زیادہ توجہ افراد کی اصلاح کی طرف دیتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ افراد کے عقائد اور اخلاق و عادات کی جس قدر اصلاح ہوگی دنیا کے وسائل کا استعمال بھی اسی قدر صحیح ہو گا اور انسانوں کی آخرت سنورنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی امن و خوشحالی کا دور دورہ ہو گا۔ ایک اچھی قوم میں کون سی باتیں اور خصلتیں ہونی چاہئیں؟ اس پر سیرتِ نبویؐ کا ایک سبق آموز واقعہ مطالعہ کے دوران نظر سے گزرا ہے جسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ حافظ ابن کثیرؒ نے

''البدایہ والنہایہ''صفحہ ۱۱۱ جلد ۵ میں بیان کیا ہے۔ جبکہ اردو میں سیرت کی معروف کتاب ''اصح السیر'' میں مولانا عبد الرؤف داناپوریؒ نے اسے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

بنو اَزد قبیلہ کا وفد حضورؐ کی خدمت میں

بنو ازد قبیلے کا ایک وفد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں سات افراد شامل تھے۔ ان میں حضرت سوید بن الحارث ازدیؓ بھی تھے اور وہی اس واقعہ کے راوی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہم حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بات چیت کی تو آپؐ ہمارے طرز گفتگو اور انداز سے خوش ہوئے اور دریافت کیا کہ تم کون لوگ ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ ہم سب اہل ایمان ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کہ ہر دعویٰ پر دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، تمہارے اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہمارے اندر پندرہ خصلتیں موجود ہیں جو ہمارے مومن ہونے کی دلیل ہیں۔ رسول اکرمؐ نے اس کی تفصیل بیان کرنے کا کہا تو ہم نے عرض کیا کہ:

اسلامی عقائد

آپ کے نمائندے نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہم ان پانچ باتوں پر ایمان لائیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر،

۲۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر،

۳۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر،

۴۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر، اور

۵۔ اس بات پر کہ مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور زندگی کے اعمال کا حساب ہوگا۔

اسلامی عبادات

اور آپ کے نمائندے نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ان پانچ باتوں پر عمل کریں:

۱۔ زبان سے کلمہ طیبہ پڑھیں،

۲۔ نماز کی پابندی کریں،
۳۔ روزے رکھیں،
۴۔ زکوٰۃ ادا کریں، اور
۵۔ استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کریں۔

اسلامی مزاج و معاشرت

جبکہ ہم میں پہلے سے جو خصلتیں موجود تھیں وہ یہ ہیں:
۱۔ آسائش اور راحت کے وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا،
۲۔ آزمائش اور تنگی کے وقت صبر کرنا،
۳۔ جو بات واقع ہو چکی ہو قدرت کا فیصلہ جان کر اس پر راضی ہو جانا،
۴۔ دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا، اور
۵۔ دشمن کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کرنا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ جن لوگوں نے تمہیں ان امور کی تعلیم دی ہے وہ حکمت و دانش والے لوگ تھے، اصحابِ علم تھے اور انہیں انبیاء کرامؑ جیسا فہم عطا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ان پندرہ خصلتوں کے ساتھ پانچ خصلتیں تمہیں اور بتا دیتا ہوں تاکہ ۲۰ مکمل ہو جائیں:

دُنیوی و اُخروی زندگی کا اسلامی تصور

۱۔ جس چیز کے کھانے کی نوبت نہ آئے اس کا ذخیرہ نہ کرو،
۲۔ ایسی عمارتیں نہ بناؤ جن میں تمہیں رہنا نصیب نہ ہو،
۳۔ جو چیز کل ہاتھ سے نکل جانے والی ہو، اس پر آج آپس میں ایک دوسرے پر برتری کا اظہار نہ کرو،
۴۔ جس خدا کے پاس تمہیں لوٹ کر جانا ہے اس سے ڈرتے رہو، اور
۵۔ جس جگہ تم نے ہمیشہ رہنا ہے اس کی طرف دھیان دو کہ تم وہاں اپنے لیے کیا کچھ بھیج رہے

ہو۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اہلِ ایمان کی ان خصلتوں کا بار بار مطالعہ کریں اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ مومن قوم کے خصائل کے حوالہ سے ہماری عملی کیفیت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو آخرت میں جنت کی کامیاب زندگی کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی غلبہ اور برتری کی بشارت دے رکھی ہے جو قرآن کریم میں واضح طور پر موجود ہے، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون سی ذات وعدوں کا ایفا کرنے والی ہوگی؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا اپنے عمل وکردار کے حوالہ سے ان اہلِ ایمان میں ہم بھی شامل ہیں؟

رسول اکرم ﷺ کا پیغام دنیا کے حکمرانوں کے نام

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۶ و ۱۸ دسمبر ۲۰۰۰ء)

غزوۂ بدر میں ابوجہل کے قتل ہو جانے کے بعد قریش کی سرداری ابوسفیان نے سنبھال لی اور فتحِ مکہ تک تمام معرکوں میں وہ قریش کی کمان کرتے رہے لیکن فتحِ مکہ کے بعد وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اپنے دورِ جاہلیت کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان سے روایت کیا ہے اور امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کے پہلے باب میں اسے نقل کیا ہے۔

حضرت ابوسفیانؓ اور قیصرِ روم کا واقعہ

یہ اس دور کی بات ہے جب جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریشِ مکہ کے درمیان حدیبیہ میں دس سال تک آپس میں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اور عارضی مصالحت کے اس دور میں جہاں جناب نبی اکرمؐ مختلف علاقوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو اسلام کی دعوت کے خطوط بھجوا رہے تھے وہاں مکہ کے قریشی بھی تجارت کے لیے آزادانہ گھوم پھر رہے تھے۔

قاصدِ رسولؐ حضرت دحیہ کلبیؓ قیصرِ روم کے دربار میں

رسول اکرمؐ نے اس وقت کی ایک بڑی بلکہ سب سے بڑی سلطنت رومن ایمپائر کے حکمران ہرقل کو بھی، جو قیصرِ روم کہلاتا تھا، دعوتِ اسلام کا خط بھجوایا۔ یہ خط حضرت دحیہ کلبیؓ لے کر گئے۔ شام اس دور میں رومی سلطنت کا حصہ تھا اور قیصرِ روم شام کے دورے پر ایلیا میں آیا ہوا تھا۔ جبکہ جناب ابوسفیان بھی ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ وہیں قیام پذیر تھے۔ آنحضرتؐ کا ہرقل کے نام خط

لے کر حضرت دحیہ کلبیؓ وہاں پہنچے۔ ہرقل کو اطلاع دی گئی کہ حجاز سے ایک قاصد آیا ہوا ہے جو نئے نبی حضرت محمدؐ کا خط اسے پیش کرنا چاہتا ہے۔ ہرقل نے خط وصول کرنے سے قبل حضورؐ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھا اور اپنے اہلکاروں سے کہا کہ ان کے علاقے سے اگر کچھ لوگ یہاں آئے ہوں تو انہیں میرے پاس لایا جائے تاکہ میں ان سے اس نئے نبی کے بارے میں دریافت کر سکوں۔ سرکاری کارندوں نے جناب ابو سفیان کو ڈھونڈ نکالا اور انہیں قیصرِ روم کے دربار میں پیش کر دیا۔

حضرت ابو سفیانؓ فرماتے ہیں کہ قیصر روم نے ہمیں دیکھ کر کہا کہ تم میں سے جو شخص اس نئے نبی سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہو وہ آگے آجائے جس پر میں آگے بڑھ گیا اور باقی ساتھی میرے پیچھے تھے۔ قیصر نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے کچھ سوالات کروں گا، ان کے صحیح جواب دینا۔ اور میرے ساتھیوں سے کہا کہ اگر یہ کسی سوال کے جواب میں غلطی کرے تو تم اسے ٹوک دینا۔

نبی کریمؐ کا تعارف

اس کے بعد قیصرِ روم نے سوالات کیے جنہیں ترتیب وار پیش کیا جا رہا ہے۔

قیصر: اس شخص کا خاندان اور نسب کیا ہے؟

ابوسفیان: یہ معزز ترین خاندان سے ہے۔

قیصر: اس خاندان میں پہلے کوئی بادشاہ گزرا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس کے خاندان میں پہلے کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس کے پیروکار کمزور لوگ ہیں یا خوشحال؟

ابوسفیان: کمزور لوگ زیادہ ہیں۔

قیصر: ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟

ابوسفیان: دن بدن بڑھ رہی ہے۔

قیصر: کوئی شخص اس پر ایمان لانے کے بعد مرتد بھی ہوا؟

ابوسفیان: نہیں۔
قیصر: تمہیں اس شخص پر کبھی جھوٹ کا شک گزرا؟
ابوسفیان: نہیں۔
قیصر: کبھی کسی معاہدے سے اس نے غداری کی؟
ابوسفیان: ہم اس وقت معاہدہ کے دور سے گزر رہے ہیں، دیکھیں کیا کرتا ہے۔
قیصر: تمہاری کبھی جنگ بھی ہوئی اور کیا نتیجہ نکلا؟
ابوسفیان: متعدّد جنگیں ہوئیں، کبھی وہ جیتا اور کبھی ہم۔
قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟
ابوسفیان: وہ کہتا ہے کہ ایک اللہ کی بندگی کرو، تمہارے باپ دادا نے جو بُت بنا رکھے ہیں انہیں چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ نماز پڑھو، سچائی اختیار کرو، پاک دامن رہو، صلہ رحمی کرو، امانت ادا کرو، اور وعدہ پورا کرو۔

قیصرِ روم کا تبصرہ

اس پر قیصرِ روم نے اپنے سوالات پر عمومی تبصرہ کیا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے کوئی نبی یا بادشاہ قریب زمانہ میں گزرا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ صاحب اس کی نقل کر رہے ہیں اور اس طریقہ سے بادشاہت دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ باقی باتیں جتنی بتائی گئی ہیں وہ انبیاءؑ ہی کے شایانِ شان ہیں کہ ان کا تعلق شریف اور معزز خاندانوں سے ہوتا ہے اور ان پر ایمان لانے والا کوئی شخص انہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ انبیاءؑ سچے لوگ ہوتے ہیں، معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں، ان کے ساتھ جنگوں میں اتار چڑھاؤ کے معاملات رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کی تعلیمات وہی ہوتی ہیں جو تم نے ان صاحب کے حوالہ سے بتائی ہیں۔

اس تبصرہ کے بعد قیصرِ روم نے کہا کہ میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ تم نے کہا ہے اگر یہ سب اسی طرح ہے تو یہ شخص میرے ان قدموں کی جگہ کا مالک ہو کر رہے گا۔ اور اگر میرے بس میں ہو تو میں ان صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے پاؤں خود اپنے ہاتھوں سے دھوؤں۔ اس موقع پر قیصرِ روم نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس بات کا اندازہ تو تھا کہ ایسے ایک پیغمبر کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ

نہیں معلوم تھا کہ یہ پیغمبر تم عربوں میں سے ہوگا۔

نبی کریمؐ کا مکتوب قیصرِ روم کے نام

حضرت ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ قیصرِ روم نے ان سے سوالات کرنے کے بعد تبصرہ کیا اور اس کے بعد حضرت دحیہ کلبیؓ نے بادشاہ کو جناب نبی اکرمؐ کا گرامی نامہ پیش کیا جس کا مضمون یہ ہے۔

"اللہ کے بندے اور رسول محمدؐ کی طرف سے

روم کے بادشاہ ہرقل کے نام

سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کر لو سلامتی پا جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر عطا فرمائیں گے۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو رومیوں کا گناہ تجھ پر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب! آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندی نہ کریں۔ اور ہم میں سے کچھ لوگ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب نہ بنائیں۔ پس اگر وہ اہلِ کتاب اعراض کریں تو تم (اہلِ اسلام) کہہ دو کہ ہم تو اس بات کو قبول کرنے والے ہیں۔"

حضرت ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ قیصرِ روم کی یہ باتیں سن کر دربار میں ہر طرف شور مچ گیا اور مختلف اطراف سے آوازیں بلند ہونے لگیں جس پر ہمیں دربار سے نکال کر دروازے بند کر دیے گئے۔ میں نے باہر آتے ہی اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کی بات تو پوری ہونے لگی ہے، رومیوں کا بادشاہ بھی اس سے خوف کھاتا ہے۔ اس کے بعد میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اب اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ حتیٰ کہ اسلام میرے دل میں داخل ہو گیا اور میں نے بالآخر اسلام قبول کر لیا۔

ابوکبشہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے خاوند کو کہا جاتا تھا جو آنحضرتؐ کی رضاعی ماں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حلیمہؓ کا بچپن میں دودھ پیا تھا جس کی نسبت سے حضرت ابوکبشہ جناب نبی اکرمؐ کے رضاعی باپ بن گئے تھے۔ مشرکینِ مکہ اسی وجہ سے حقارت آمیز لہجہ میں آنحضرتؐ کو ابوکبشہ کا بیٹا کہا کرتے تھے۔

قیصرِ روم کی پریشانی اور جستجو

آپؐ کا خط پڑھے جانے کے بعد دربار میں شور و غوغا ہوا تو ابو سفیان اور ان کے ساتھیوں کو دربار سے نکال کر دروازے بند کر دیے گئے۔ لیکن بادشاہ کے دربار میں کیا ہوا؟ وہ شام کے اس وقت کے چیف پادری ابن ناطورا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے جو بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت میں مذکور ہے۔

ابن ناطورا اس واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیصرِ روم ہرقل بادشاہ ایک روز صبح کے وقت انتہائی سست اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ قریبی ساتھیوں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ میں رات ستاروں کو دیکھ رہا تھا تو ستاروں کی چال سے مجھے معلوم ہوا کہ ملک الختان کا ظہور ہو گیا ہے یعنی ختنے والوں کا بادشاہ ظاہر ہو گیا ہے اور اس کے غلبہ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ختنہ کرنے والے لوگ کون اور کہاں ہیں؟ سرکاری پادریوں اور مصاحبوں نے جواب دیا کہ یہودی ختنہ کرتے ہیں لیکن وہ تو اس پوزیشن میں نہیں کہ ہمیں پریشان کر سکیں۔ وہ بہت تھوڑی تعداد میں ہیں، آپ مدائن کے حاکم کو حکم دیں وہ ان کا خاتمہ کر دے گا۔ اس دوران غسان کے بادشاہ نے قیصرِ روم کو خبر دی کہ حجاز میں ایک نئے نبی کا ظہور ہوا ہے۔ قیصر نے دریافت کیا کہ کیا یہ لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ جواب ملا کہ ہاں ان کے ہاں ختنہ ہوتا ہے۔ تو اس وقت سے قیصر روم کے دل میں جناب نبی کریمؐ کے بارے میں بات بیٹھ گئی۔

ابن ناطورا کے مطابق ہرقل بادشاہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ اس امت نسلِ انسانی کا بادشاہ ہے جو ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ہرقل نے اپنے ایک صاحبِ علم اور ساتھی کو ساری تفصیل لکھ کر روانہ کی اور اس سے رائے چاہی جبکہ بادشاہ خود حمص کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ جب حمص پہنچا تو اس کے پاس اس صاحبِ علم ساتھی کا جواب آ چکا تھا، اس نے ہرقل کی رائے کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ مکہ میں جس کا ظہور ہوا ہے وہ واقعی نبیؐ ہے۔

قیصرِ روم کے درباریوں کا ردعمل

چنانچہ بادشاہ نے حمص کے ایک ہال میں روم کے سرداروں کو جمع کیا اور ان کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا کہ اگر تم فلاح اور رشد چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بادشاہت قائم رہے تو اس نبیؐ کے

ہاتھ پر بیعت کر لو۔ یہ سن کر ہال میں شور مچ گیا، طرح طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور بہت سے لوگ وحشی گدھوں کی طرح ہال سے باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ اس پر ہرقل بادشاہ نے انہیں باہر جانے سے روکا اور کہا کہ ٹھہرو میں تو یہ باتیں تمہارے امتحان کے لیے کر رہا تھا تاکہ تمہارے ایمان کی مضبوطی دیکھوں اور وہ میں نے دیکھ لی ہے۔ قیصر روم کے اس اعلان پر درباریوں کے قدم رک گئے اور وہ واپس آکر بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

سچ اور اقتدار کی کشمکش

یوں سچ اور اقتدار کے درمیان وہ کشمکش اپنے انجام کو پہنچی جس نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے مطلق العنان حکمران کے ذہن میں کچھ عرصہ سے ہلچل مچا رکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتدار والوں کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں اور وہ ایک حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس کے اعتراف سے کیوں رک جاتے ہیں۔

آج پھر تاریخ خود کو دہرا رہی ہے کہ نسلِ انسانی اخلاقی، معاشرتی اور معاشی طور پر ہولناک تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ استحصال اور ظلم و غصب نے عالمی نظام کے خوشنما لیبل کے ساتھ پورے انسانی معاشرہ پر اپنے خونی پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ہر طرف افراتفری اور جبر و تشدد کا دور دورہ ہے، پسے ہوئے طبقات دنیا کے ہر خطے میں کسی نجات دہندہ کی راہ تک رہے ہیں، اور اعلیٰ دانش گاہوں میں موجودہ ورلڈ سسٹم کی ناکامی اور تباہ کاریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے متبادل سسٹم کی تلاش جاری ہے۔ یہ بات اب ہر ایک کی سمجھ میں آ رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی کی طرف واپسی کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ اور یہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی الٰہی کا محفوظ ذخیرہ صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ اس کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ تاریخ کے ایک عظیم الشان ریکارڈ کے طور پر آج کے قیصروں، بادشاہوں اور حکمرانوں کو بھی مسلسل دعوت دے رہا ہے کہ ''اسلام قبول کر لو سلامتی پا جاؤ گے۔''

لیکن بات یہ ہے کہ جب مسلم ممالک کے دارالحکومتوں میں بیٹھے ہوئے حکمران اس پیغام کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو دوسروں سے اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ آج کے مسلمان حکمران انسانی

سوسائٹی پر اسلامی احکام و قوانین کی عملداری میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ وہ جناب نبی اکرمؐ کا کلمہ پڑھتے ہوئے، آپؐ کی محبت کا دم بھرتے ہوئے، اور آپؐ کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بھی اس آخر الزمان پیغمبرؐ کے سلامتی کے پیغام کے حوالہ سے ''قیصرِ روم'' بنے بیٹھے ہیں۔ مگر تاریخ کسی ایک جگہ رک نہیں جایا کرتی، وہ اپنی طبعی رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور ''قیصر'' اپنی تمام تر شوکت و سطوت کے باوجود اس کے دھندلکوں میں گم ہو جایا کرتے ہیں۔

مشکلات و مصائب میں اسوۂ نبوی ﷺ

(جنوری ۲۰۰۱ء کے دوران مسجد بلال بن رباحؓ دوبئی میں خطاب۔
مطبوعہ ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ فروری ۲۰۰۱ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج کے اس اجتماع سے جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمن تفصیلی خطاب کریں گے۔ ان سے قبل مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کو کہا گیا ہے، اس لیے بطور تمہید چند باتیں آپ سے عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے ہمارے فاضل دوست مولانا مفتی عبد الرحمن نے اپنے خطاب میں افغانستان کی طالبان حکومت کا ذکر کیا ہے اور اسے درپیش مشکلات کا حوالہ دیا ہے۔

طالبان کی مشکلات اور شعبِ ابی طالب

بلاشبہ ''طالبان'' آج کے دور کا مظلوم ترین طبقہ ہے جس کے خلاف کفر و نفاق کی پوری دنیا متحد ہو گئی ہے اور انہیں عالمی استعمار کے سامنے جھکانے یا مٹا دینے کے لیے منصوبے بن چکے ہیں۔ طالبان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کا صرف نام نہیں لیتے بلکہ اپنے ملک میں اسلامی احکام و قوانین کو عملی طور پر نافذ بھی کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کے بین الاقوامی دباؤ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا اصل جرم یہی ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف پابندیوں اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے، اس سے قبل بھی اہلِ حق اس قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے آ رہے ہیں حتیٰ کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ مکرمہ کے کفار کی طرف سے اس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا جب قریش کے باقی خاندانوں نے بنو ہاشم سے مطالبہ کیا تھا کہ محمدؐ کو قتل کے لیے ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن بنو ہاشم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں قریش کے تمام قبائل نے مل کر بنو ہاشم کا سوشل بائیکاٹ کر دیا اور جناب رسول اللہؐ اپنے خاندان سمیت شعبِ ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔

کفار کی طرف سے یہ پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ ان کے ساتھ لین دین نہیں ہوگا، ان سے رشتہ داری قائم نہیں کی جائے گی، ان کے پاس خوراک وغیرہ کی کوئی چیز نہیں جانے دی جائے گی اور ان کی معاشی ناکہ بندی ہوگی۔ اس دوران آنحضرتؐ اور ان کے ساتھیوں کو کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اس ارشاد سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم درختوں کے پتے کھا کر گزارے کیا کرتے تھے اور راستے میں پڑا ہوا خشک چمڑا اٹھا لیتے تھے اور اسے گرم پانی میں نرم کر کے چبا کر نگل لیا کرتے تھے۔

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وادی میں بھوک کے بچے جب روتے چلاتے تو ارد گرد گھومنے والے مشرکین یہ آوازیں سن کو خوش ہوا کرتے تھے۔ اس کیفیت کے ساتھ نبی اکرمؐ اور ان کے خاندان کو محصور رہنا پڑا لیکن مشرکین کی عائد کردہ یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہ روک سکیں اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کا عمل نہ صرف جاری رہا۔ بلکہ اس دوران حضرت ابوذر غفاریؓ اور بہت سے دیگر حضرات نے اسلام قبول کیا اور مشرکین کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی پابندیاں اور ناکہ بندی تین سال گزرنے کے باوجود کارگر نہیں ہو رہی تو کچھ سمجھ دار مشرکین نے آگے بڑھ کر وہ معاہدہ ختم کرا دیا۔

اس لیے آج بھی یہ پابندیاں اسلام کا راستہ نہیں روک سکیں گی اور اگر طالبان حکومت اپنے مشن اور پروگرام پر استقامت کے ساتھ گامزن رہی تو پابندیاں لگانے والوں کو بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا فیصلہ کس قدر غلط تھا۔

مصائب و مشکلات میں اسلام کا مزاج

میں اس موقع پر اس صورتحال کے حوالہ سے آپ حضرات کی خدمت میں ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشکلات و مصائب کے بارے میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اس پر سیرتِ نبویؐ سے دو واقعات پیش کروں گا تاکہ یہ بات ہمارے سامنے رہے کہ مشکلات و مصائب کے دور میں سنتِ نبویؐ کیا ہے۔

ہجرتِ مدینہ، سراقہ، کسریٰ کے کنگن

ایک واقعہ تو اس وقت کا ہے جب آنحضرتؐ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت ظاہری کیفیت یہ تھی کہ خود اپنی جان کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا، رات کی تاریکی میں چھپ کر مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، سفر کے لیے عام راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ خفیہ راستے سے سفر کر رہے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے ہمراہ تین دن تک غارِ ثور میں روپوش رہے اور راستہ میں چلتے ہوئے کسی کو اپنے نام بتانے میں بھی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ تو ظاہری کیفیت تھی کہ بظاہر جان کا بچانا مشکل ہو رہا تھا لیکن اسی دوران سراقہ بن مالکؓ جناب نبی اکرمؐ کو راستہ میں ملے اور پکڑنے میں ناکام ہو کر امان چاہی تو حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ

"سراقہ، میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں"

یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت کا بھی اظہار تھا جس میں ہمارے لیے دو سبق ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ خدائی فیصلے ظاہری حالات پر نہیں ہوتے۔ ظاہری حالات جس قدر بھی ناموافق ہوں، اگر مسلمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہے اور اس کا ایمان ویقین پختہ ہے تو ظاہری حالات کی ناسازگاری اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔

۲۔ اور دوسرا سبق یہ ہے کہ مسلمان کو ظاہری حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، مشکلات کتنی ہی کیوں نہ ہوں، اسے اپنا ہدف سامنے رکھنا چاہیے اور ٹارگٹ میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔

اب دیکھیے کہ جناب رسول اللہؐ ظاہری طور پر کس حال میں ہیں کہ چھپ کر اور جان بچا کر مدینہ منورہ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نظر کہاں ہے؟ کسریٰ کے کنگنوں پر جو اس وقت کی ایک بڑی سلطنت کا حکمران تھا۔ اور سراقہ بن مالکؓ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اسے کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور پھر یہ صرف ایک وقتی بات نہیں تھی بلکہ پیشگوئی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں فارس فتح ہوا، کسریٰ کے شاہی خزانے غنیمت کے مال میں مدینہ منورہ آئے، ان میں وہ کنگن بھی تھے جو کسریٰ بادشاہ دربار میں پہنا کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے سراقہ بن مالک کو بلایا اور یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے کسریٰ کے کنگن انہیں پہنائے کہ اگرچہ سونے کے کنگن پہننا مرد کے لیے جائز نہیں ہے لیکن رسول اللہؐ کی پیش گوئی کو پورا کرنے کے لیے میں یہ کنگن کچھ دیر کے لیے تمہیں پہنا رہا ہوں۔ اس طرح رسول اکرمؐ نے ہمیں سبق دیا کہ مشکلات و مصائب اور حالات کی ناسازگاری سے گھبرا کر مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور اپنے ہدف اور ٹارگٹ میں کوئی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔

غزوۂ خندق کی تیاری

دوسرا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بدر و اُحد کی جنگ میں ناکام و نامراد ہو کر قریشِ مکہ نے یہ بات سمجھ لی کہ وہ اکیلے جناب نبی اکرمؐ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے عرب قبائل سے گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کا متحدہ محاذ بنوایا اور ایک بہت بڑا لشکر لے کر مدینہ منورہ کی طرف یلغار کر دی۔ یہ غزوۂ احزاب کی بات ہے جسے غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف عرب قبائل کا بہت بڑا متحدہ محاذ تھا اور دوسری طرف حضورؐ اور ان کے ساتھی تھے جن کی تعداد چھوٹے بڑے سب ملا کر ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ آپؐ نے مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کھودنے کا پروگرام بنایا اور خود صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر دن رات خندق کھودنے میں مصروف رہے۔

خوف و بھوک کی ظاہری کیفیت

قرآن کریم نے سورۃ الاحزاب میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اہلِ ایمان کو یاد دلایا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب تم پر چاروں طرف سے لشکر چڑھ دوڑے تھے، جب تمہاری آنکھیں خوف کے مارے پتھرا گئی تھیں، جب خوف کی شدت سے تمہارے دل سینوں سے اچھل کر حلق میں پھنس گئے تھے، جب تم اللہ تعالیٰ کی مدد کے بارے میں گمانوں کا شکار ہونے لگے تھے، جب مومنوں کو آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا اور جب ان پر شدید زلزلے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

یہ اس وقت کی ظاہری کیفیت تھی جس کا نقشہ قرآن کریم ان الفاظ میں کھینچ رہا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ بہت سے خندق کھودنے والوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا اور بعض لوگوں نے بھوک کی

شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے حتیٰ کہ ایک صاحب نے آنحضرتؐ کو اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ اس نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے تو آپؐ نے اپنے پیٹ مبارک سے کپڑا اٹھا کر دکھا دیا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اس صورتحال میں جب ظاہری طور پر سخت مایوسی اور شدید خوف کی کیفیت مدینہ منورہ کی آبادی کا احاطہ کیے ہوئے تھی، حضورؐ سے خندق میں ایک چٹان کے سخت ضربوں کے باوجود نہ ٹوٹنے کی شکایت کی گئی، چنانچہ آپؐ خود تشریف لے گئے اور کدال کی ایک ہی ضرب سے چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

نبی کریمؐ کی پیشگوئی

جب آپ نے کدال سے چٹان پر ضرب لگائی تو وہاں سے چمک اٹھی اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"مجھے اس چمک میں قیصر وکسریٰ کے محلّات دکھائی دیے ہیں"

ظاہری کیفیت دیکھیے کہ خوف اور مایوسی کا کیا عالم ہے؟ اور اس حالت میں نظر کی بلندی ملاحظہ کیجیے کہ اس وقت کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے شاہی محلّات دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے خوشخبری تھی اور یہ سبق تھا کہ ظاہری حالات سے مایوس نہ ہو بلکہ اللہ تعالی کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھو، اس پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مشن پر گامزن رہو اور اپنے ٹارگٹ اور ہدف میں کوئی کمزوری نہ آنے دو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر سازوسامان اور لشکر کی کثرت کے باوجود قبائل عرب کی یہ یلغار ناکام ہوئی اور اللہ تعالی نے جناب نبی اکرمؐ کو نہ صرف فتح عطا فرمائی بلکہ اس پیشگوئی کے مطابق قیصر وکسریٰ کے شاہی محلّات بھی اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں کو عطا فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے کہ آزمائش اور ابتلا کے اس سخت ترین دور کے بعد غزوۂ احزاب میں اللہ تعالی نے مسلمانوں کی مدد اس طرح کی کہ ہوا کو تیز کر دیا اور غیبی لشکر آسمان سے اتارے جنہوں نے محاصرہ کرنے والے کافروں کے لشکر کو تتر بتر کر دیا اور وہ کوئی مقصد حاصل کیے بغیر ناکام واپس لوٹ گئے۔ اس لیے ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ طالبان کی اسلامی حکومت اگر اسلام کے مکمل اور عملی نفاذ کے مشن پر قائم رہتی ہے اور ظاہری حالات کی ناسازگاری سے خوفزدہ نہیں ہوتی تو اس کے لیے بھی غیب

کی قدرتیں حرکت میں آئیں گی اور امریکہ کی قیادت میں عالمی استعمار کا ان کے خلاف متحدہ محاذ اسی طرح ناکام ہوگا جس طرح جناب رسول اللہؐ کے خلاف قبائل عرب کا اتحاد ناکام ہوگیا تھا۔ البتہ ہمیں اس حوالہ سے اپنی ذمہ داریوں پر ضرور نگاہ رکھنی چاہیے کہ اپنے مظلوم طالبان بھائیوں کی اس مشکل وقت میں ہم کیا مدد کر سکتے ہیں اور ان کا ہاتھ کس طرح بٹا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقہ سے نباہنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

---

۱۹ جنوری ۲۰۱۵ء کو متحدہ علماء دیوبند شاہدرہ لاہور کے زیر اہتمام
رانا ٹاؤن میں علماء کرام کے اجتماع سے خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حالات کے اتار چڑھاؤ سے یقیناً پریشانی ہوتی ہے لیکن یہ اتار چڑھاؤ تاریخ کا ناگزیر حصہ ہے اور اہلِ حق کے سفر کے سنگ میل ہی مسائل و مشکلات اور مصائب و آلام ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اور میں اس سلسلہ میں دورِ نبویؐ کے دو تین واقعات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ ایسے حالات میں ہمیں کیسے کام کرنا چاہیے؟

ہجرتِ مدینہ کا پُر خطر سفر

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ کی طرف جا رہے تھے تو ظاہری کیفیت یہ تھی کہ چھپتے چھپاتے مدینہ منورہ پہنچنے کی کوشش تھی۔ عام راستے سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے، اور زیادہ تر سفر رات کو کرتے تھے۔ اہلِ مکہ کی طرف سے بھیجی جانے والی بہت سی ٹولیاں تعاقب میں تھیں جن سے بچنے کے لیے تین دن غارِ ثور میں روپوش بھی رہے تھے۔ مگر جب دوران سفر سراقہ بن مالکؓ کا سامنا ہوا تو آنحضرتؐ نے انہیں فرمایا کہ میں تمہارے ہاتھ میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ اپنے وقت پر یہ کنگن انہیں حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں پہنا بھی دیے۔ یہ جناب رسول اللہؐ کا معجزہ تھا مگر اس کے ساتھ اس میں یہ سبق بھی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی کسی مسلمان کو اپنے مشن اور پروگرام سے غافل نہیں رہنا چاہیے اور اپنے حوصلہ کی سطح کو قائم رکھنا چاہیے۔

غزوۂ خندق کی مشکلات

غزوۂ خندق میں جب مدینہ منورہ کی آبادی پر خوف وہراس کی کیفیت طاری تھی اور دشمن کے پہنچنے سے قبل خندق کو کھود لینا ہی سب سے اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ جناب رسول اللہؐ نے ایک چٹان پر کدال سے ضرب لگائی تو اس سے چنگاریاں پھوٹیں جن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اس چمک میں قیصر کے محلّات دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی سبق تھا کہ حالات کی سنگینی وقتی بات ہے، ان کا حوصلے کے ساتھ سامنا کرو اور اپنے مقصد اور منزل کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔

جنگِ موتہ کی شکست اور حضرت خالد بن ولیدؓ

اس کے ساتھ ہی علماء کرام کو ایک اور واقعہ کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل حضرت خالد بن ولیدؓ کو جناب نبی اکرمؐ نے سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب دیا تھا۔ مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ خطاب انہیں کون سے کارنامے پر ملا تھا؟

موتہ کی جنگ میں حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی یکے بعد دیگرے شہادت کے بعد جب مسلمانوں کے لشکر کی کمان حضرت خالد بن ولیدؓ نے سنبھالی تو آنحضرتؐ نے مدینہ منورہ میں اپنے ساتھیوں کو اس کی خبر دی اور فرمایا کہ اب مسلمانوں کی کمان اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالد بن ولیدؓ) نے سنبھال لی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضورؐ نے حضرت خالدؓ کے لیے سیف اللہ کا لقب ارشاد فرمایا تھا۔ اس وقت ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے دشمن کی فوج کے نرغے میں گھرے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بحفاظت وہاں سے نکال کر مدینہ منورہ میں ان کے گھروں تک پہنچا دیا تھا۔ اور اس عظیم خدمت پر سیف اللہ کے خطاب کے مستحق قرار پائے تھے، جبکہ ان کی واپسی پر مدینہ منورہ کے عام لوگوں نے انہیں انتم الفرارون (تم بھگوڑے ہو) کہہ کر پکارا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد صرف لڑنے اور ہر حال میں لڑتے رہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اپنے ساتھیوں کی حفاظت اور انہیں نرغے سے نکال کر گھر واپس لے آنا بھی جہاد کہلاتا ہے۔

دینی جدوجہد کیلئے سنتِ نبویؐ سے راہنمائی

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ اور صحابہ کرامؓ کے اسوۂ حسنہ سے راہنمائی حاصل کر کے حالات کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔ اس پس منظر میں بطور مشورہ میں علماء کرام سے گزارش کروں گا کہ آج کے حالات کے دائرے میں رہتے ہوئے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ:

- ہر قسم کے تصادم سے گریز کریں اور قانون و دستور کی حدود میں رہتے ہوئے دینی جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔
- دینی جدوجہد سے بالکل لاتعلق رہنا میرے نزدیک کسی بھی عالم کے لیے جائز نہیں ہے۔ علماء کرام کو دینی جدوجہد میں کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرتے رہنا چاہیے۔
- دینی جدوجہد کے تمام شعبے مثلاً نفاذِ شریعت، دعوت و تبلیغ، جہاد، تحفظِ ناموس رسالتؐ، عقیدۂ ختم نبوت کی حفاظت، دفاعِ صحابہ کرامؓ، دفاعِ حنفیت، دفاعِ مسلک وغیرہ سب دین کے شعبے ہیں، ان میں جس شعبہ کے ساتھ ذوق وابستہ ہو اس میں کام کرنا چاہیے۔
- جبکہ ایک دوسرے کے کام کی نفی اور مخالفت سے ہر قیمت پر گریز کرنا چاہیے۔ آپ اپنے ذوق کے شعبہ میں کام کرتے ہوئے دوسرے کسی شعبہ کے ساتھیوں سے تعاون کر سکیں تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔ ورنہ مخالفت نہ کریں، ان کے کام کو ہلکا مت سمجھیں اور کسی کا مذاق نہ اڑائیں۔ کیونکہ ہمارا یہ باہمی تعاون و احترام ہی دینی جدوجہد میں مثبت پیشرفت کا ضامن ہوگا۔

سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم

(۱۶ مئی ۲۰۰۲ء کو شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام ”سیرۃ النبیؐ کانفرنس“ سے خطاب۔ مطبوعہ ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جون ۲۰۰۲ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں شیخ زاید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا شکر گزار ہوں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے موضوع پر منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں شرکت اور گفتگو کے اعزاز سے نوازا۔ اور دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرماتے ہوئے کچھ مقصد کی باتیں کہنے، سننے اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

مجھے گفتگو کے لیے ”سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم“ کا عنوان دیا گیا ہے جس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ حتیٰ کہ تذکرہ بھی اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے اس لیے بہت سے امور کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک ایسے سوالات کا جائزہ لینا چاہوں گا جو جہاد کے حوالے سے آج کے دور میں عالمی سطح پر موضوعِ بحث ہیں اور ان کے بارے میں مثبت اور منفی طور پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے۔

جہاد کا لغوی و خصوصی مفہوم

”جہاد“ کا لفظ لغوی مفہوم کے حوالے سے کوشش، محنت و مشقت اور تگ ودو کی مختلف شکلوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسے دینی پس منظر میں لیا جائے تو اسلام کی سربلندی، دعوت و تبلیغ، ترویج و تنفیذ، اور تحفظ و دفاع کے لیے کی جانے والی مختلف النوع عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنی خواہشات پر کنٹرول اور نفس کی اصلاح کی مساعی پر بھی جہاد کا لفظ بولا گیا ہے جس کی قرآن وسنت میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن جہاد کا ایک خصوصی مفہوم ''جنگ'' اور ''محاربہ'' بھی ہے جسے قرآن کریم میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور ''قتال'' کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے اور سینکڑوں آیات قرآنی اور ہزاروں احادیثِ نبویہؐ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اور اِس جہاد کے فضائل، احکام، مسائل اور مقصدیّت پر قرآن وسنت میں پورے اہتمام کے ساتھ جابجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ہے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کافروں کے خلاف میدانِ جنگ میں صف آرا ہو کر ہتھیاروں کے ساتھ ان سے معرکہ آرائی کرنا، اور قتل وقتال کے ذریعے سے کفر پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا جس کی اہمیت وفضیلت پر قرآن کریم اور سنتِ نبویؐ کی سینکڑوں تصریحات گواہ ہیں۔ اور اس کو آج کے دور میں اس وجہ سے سب سے زیادہ تنقید واعتراض کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ جدید عقل ودانش کے نزدیک عقیدہ ومذہب کے فروغ اور غلبہ کے لیے ہتھیار اٹھانا تہذیب وتمدن کے تقاضوں کے خلاف ہے اور ایسا کرنا بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے دائرے میں آتا ہے۔

عقیدہ ومذہب کی بالادستی کیلئے ہتھیار اٹھانے کی روایت

اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ عقیدہ ومذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے اور باطل مذاہب پر حق مذہب کی بالادستی کے لیے عسکری جنگ لڑنے کا آغاز حضرت محمد رسول اللہؐ نے نہیں کیا بلکہ جہاد کا یہ عمل آسمانی ادیان میں پہلے سے تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے، اور جناب نبی اکرمؐ نے اس حوالے سے تاریخ میں کسی نئے عمل اور اسلوب کا اضافہ کرنے کے بجائے آسمانی مذاہب کی ایک مسلسل روایت کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ جس طرح قرآن کریم میں جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ پایا جاتا ہے، اسی طرح بائبل میں بھی ان مجاہدین اور مذہبی جنگوں کا ذکر موجود ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے مذہب کے دفاع اور اپنی آزادی اور تشخص کے تحفظ کے لیے لڑیں۔

مثال کے طور پر قرآن کریم نے فلسطین کی سرزمین پر لڑی جانے والی ایک مقدس جنگ کا سورۃ البقرۃ میں تذکرہ کیا ہے جو جالوت جیسے ظالم حکمران کے خلاف حضرت طالوتؑ کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت بادشاہ کا معجزانہ طور پر خاتمہ ہوا۔ اس جنگ کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے اور اس میں حضرت طالوتؑ کا ''ساؤل بادشاہ'' کے نام سے ذکر کیا گیا

ہے۔

اس لیے اگر آج کی جدید دانش کو مذہب کے نام پر ہتھیار اٹھانے پر اعتراض ہے تو اس کا ہدف صرف قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی نہیں بلکہ اصولی طور پر بائبل اور بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ اس کی زد میں ہے۔ صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ بائبل کے ماننے والوں نے بائبل پر ایمان کے دعوے کے باوجود اس کے عملی احکام اور ماضی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے، جبکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے تمام تر عملی کمزوریوں کے باوجود اپنے ماضی اور قرآنی احکام و تعلیمات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسلام میں جہاد کی مقصدیّت

اس وضاحت کے بعد جہاد کی مقصدیّت کے حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا مقصد آنحضرتؐ نے اعلاء کلمۃ اللہ قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔ جس کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں حکم اور قانون کا درجہ انسانی خواہشات اور ظن و گمان کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور آسمانی تعلیمات کو حاصل ہونا چاہیے۔ اور کلمۃ اللہ کی اسی سربلندی کے لیے قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ نے آسمانی مذاہب کی ان دینی معرکہ آرائیوں کے تسلسل کو باقی رکھا ہے تاکہ کسی دور میں بھی انسانی خواہشات اور عقل و گمان کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر غلبہ حاصل نہ ہونے پائے، اور انسانی سوسائٹی پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی عملداری کے جس مشن کے لیے حضرت انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے ہیں، اس میں تعطل واقع نہ ہو۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ نے ایک ارشاد مبارک میں یہ کہہ کر اس جدوجہد کے قیامت تک جاری رہنے کا اعلان فرما دیا ہے کہ الجهاد ماضٍ الی یوم القیامة۔

یہ فکر و فلسفہ کی جنگ ہے، اسلوبِ زندگی کی معرکہ آرائی ہے، اور تہذیب و ثقافت کا محاذ ہے، جس میں شروع سے آسمانی مذاہب کا یہ موقف رہا ہے اور اب آسمانی مذاہب و ادیان کے حقیقی وارث کی حیثیت سے اسلام کا موقف بھی یہی ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہنمائی اور اس کے مسائل کے حل کے لیے انسانی خواہشات اور عقل و دانش تنہا کفایت نہیں کرتیں بلکہ ان پر آسمانی تعلیمات کی نگرانی ضروری ہے۔ کیونکہ اس ''چیک اینڈ بیلنس'' کے بغیر انسانی خواہشات اور انسانی عقل کے لیے پوری نسلِ انسانی

کی ضروریات و مفادات میں توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تہذیبِ جدید نے آسمانی تعلیمات سے دستبرداری کا اعلان کر کے خواہشات اور عقل ہی کو تمام امور کی فائنل اتھارٹی قرار دے رکھا ہے جس سے توازن بگڑ گیا ہے۔ اجتماعی اخلاقیات دم توڑ گئی ہیں، طاقت کا بے لگام گھوڑا وحی الٰہی کی لگام سے آزاد ہو گیا ہے، اور پوری دنیا میں ہر طرف جنگل کے قانون کا دور دورہ ہے۔

جنگی ہتھیار اور تباہی آج کے دور میں

آج کی جدید دانش نے چونکہ مذاہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے شخصی زندگی کے دائروں میں محدود کر دیا ہے، اس لیے عقلِ جدید کے نزدیک مذہب کو وہ مقام حاصل نہیں رہا کہ اس کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں اور اس کے فروغ و تنفیذ کے لیے عسکری قوت کو استعمال میں لایا جائے۔ ورنہ ہتھیار تو آج بھی موجود ہیں اور جتنے ہتھیار آج پائے جاتے ہیں اور تیار ہو رہے ہیں، انسانی تاریخ میں ا سے قبل کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ ہتھیار استعمال بھی ہوتے ہیں اور وہ تباہی لاتے ہیں کہ اس سے قبل کی انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، مگر ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والوں کے مقاصد اور عنوانات مختلف ہیں:

- جرمنی نے جرمن نسل کی برتری کے عنوان سے ہتھیار بنائے اور دو عظیم جنگوں میں پوری دنیا کے لیے تباہی کا سامان فراہم کیا۔
- روس نے محنت کشوں کی طبقاتی بالادستی کے نام پر عسکری قوت کا بے تحاشا استعمال کیا اور نسلِ انسانی کے ایک بڑے حصے کو تہہ تیغ کر دیا۔
- اسرائیل ایک نسلی مذہب کی برتری کے لیے اپنے سائز سے سینکڑوں گنا زیادہ ہتھیار جمع کیے ہوئے ہے اور فلسطینیوں کی مسلسل نسل کشی میں مصروف ہے۔
- اور امریکہ نے مغربی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام پر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔

فکر و فلسفہ کے تحفظ کیلئے ہتھیار اٹھانے کا جواز

سوال یہ ہے کہ اگر نسلی برتری، طبقاتی بالادستی، اور تہذیب وثقافت کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانا، اور صرف اٹھانا نہیں بلکہ اسے وحشیانہ انداز میں اندھا دھند استعمال کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا دہشت گردی نہیں ہے، تو آسمانی تعلیمات کے فروغ اور وحی الٰہی کی بالادستی کے لیے ہتھیار اٹھانے کو کون سے قانون اور اخلاقیات کے تحت دہشت گردی قرار دیا جارہا ہے؟

باقی تمام پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آج کی معروضی صورتحال میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لے لیں کہ افغانستان اور دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کا نام لینے والوں کے خلاف "عالمی اتحاد" کے پرچم تلے جو وحشیانہ فوج کشی جاری ہے، اس کے جواز میں اس کے علاوہ اب تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکی کہ اسلام کا نام لینے والے ان مبینہ انتہا پسندوں سے آج کی عالمی تہذیب کو خطرہ ہے، بالادست ثقافت کو خطرہ ہے، اور بین الاقوامی نظام کو خطرہ ہے، اس لیے ان انتہا پسندوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عقیدہ و مذہب کے لیے ہتھیار اٹھانے کو دہشت گردی کہنے والے خود ایک مذہب اور عقیدہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے میدانِ جنگ میں مسلسل صف آرا ہیں۔

میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانے اور اسے بے دریغ استعمال کرنے کا ایک فریق کو حق حاصل ہے تو اس کے خلاف دوسرے عقیدہ، فلسفہ، اور تہذیب کے علمبرداروں کو ہتھیار اٹھانے کے حق سے کسی طرح محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے کے لیے یہ کوئی وجۂ جواز نہیں ہے کہ چونکہ ایک فریق کے پاس ہتھیار بنانے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اسے ان ہتھیاروں کے استعمال کے مواقع زیادہ میسر ہیں، اس لیے اسے تو ہتھیار بنانے اور چلانے کا حق حاصل ہے، اور دوسرا فریق اس صلاحیت میں کمزور اور ان مواقع کی فراوانی سے محروم ہے اس لیے اسے اس کا سرے سے کوئی حق نہیں ہے۔

آج امریکہ اور اس کے اتحادی اس بات پر مطمئن ہیں کہ جو جنگ وہ لڑ رہے ہیں، وہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر لڑی جارہی ہے، انسانیت کی بھلائی کی جنگ ہے، اور ان کے بقول اعلیٰ ترین تہذیبی اقدار کے

تحفظ کی جنگ ہے۔ جنگ کی اسی مقصدیت کی وجہ سے انہیں اس عظیم جانی ومالی نقصان کی کوئی پروا نہیں ہے جو دنیا بھر میں ان کے ہاتھوں مسلسل جاری ہے۔ انسان مر رہے ہیں، عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں، بچے یتیم ہو رہے ہیں، عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو رہی ہیں، ملکوں اور قوموں کی معیشتیں تباہ ہو رہی ہیں، اور امن وامان کا توازن مسلسل بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے چونکہ اپنے زعم کے مطابق یہ سب کچھ اعلیٰ مقاصد کے لیے کر رہے ہیں اور ان اقدامات کے ذریعے سے اعلیٰ تہذیب وثقافت کا تحفظ کر رہے ہیں اس لیے ان کے خیال میں یہ سب کچھ جائز ہے اور جنگ کا حصہ ہے جسے کسی چون وچرا کے بغیر پوری نسل انسانی کو برداشت کرنا چاہیے۔

یہی بات اسلام کہتا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نسلِ انسانی کے لیے نجات کا راستہ انسانی خواہشات اور صرف انسانی عقل نہیں ہے بلکہ وحی الٰہی کی نگرانی اور آسمانی تعلیمات کی برتری انسانی سوسائٹی کے لیے ضروری ہے۔ اور اسلام کے نزدیک انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور تہذیبی روایات کا سرچشمہ انسانی خواہشات اور عقلِ محض نہیں بلکہ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہیں۔ اس لیے ایک مسلمان اگر ان مقاصد کے لیے ہتھیار اٹھاتا ہے تو دنیا کی مسلّمہ روایات اور تاریخی عمل کی روشنی میں اسے یہ کہہ کر اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ مخالف فریق کے نزدیک اس کا یہ عمل دہشت گردی قرار پا گیا ہے۔

جہاد کی عملی صورتیں

اس اصولی وضاحت کے بعد قرآن وسنت کی رو سے جہاد کی چند عملی صورتوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بنی اسرائیل کا جہاد

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے حوالے سے جہاد کے ایک حکم کا تذکرہ سورۃ المائدہ میں کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے چنگل سے بنی اسرائیل کو نکال کر صحرائے سینا میں خیمہ زن ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو حکم ملا کہ وہ ”بیت المقدس“ کو عمالقہ سے آزاد کرنے کے لیے جہاد کریں اور آگے بڑھ کر حملہ آور ہوں۔ مگر غلامی کے دائرے سے تازہ تازہ نکلنے والی مرعوب قوم

کو اس کا حوصلہ نہ ہوا اور پھر اس کے چالیس سال بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جنگ لڑ کر بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل ہی کے حوالے سے ایک اور جہاد کا تذکرہ کیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں کہ جالوت نامی ظالم بادشاہ نے فلسطین کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے بنی اسرائیل کو مظالم کا شکار بنانا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام کے حکم پر طالوت بادشاہ کی قیادت میں بنی اسرائیل کی مٹھی بھر جماعت نے جالوت کا مقابلہ کیا اور اسے میدانِ جنگ میں شکست دے کر فلسطین کے علاقے آزاد کرائے۔

اسلامی غزوات

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں کفارِ مکہ کے خلاف پہلے بڑے معرکے کی قیادت بدر کے میدان میں کی اور قریش کو شکست دے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ جنگ قریشِ مکہ کے ان عزائم پر ضرب لگانے کے لیے بپا ہوئی تھی جو وہ اسلام کو ختم کرنے اور جناب نبی اکرمؐ اور ان کی جماعت کو ناکام بنانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔

- اس کے بعد ''احد'' اور ''احزاب'' کی جنگیں بھی اسی پس منظر میں تھیں اور اس کشمکش کا خاتمہ اس وقت ہوا جب آپؐ نے ۸ھ میں خود پیش قدمی کر کے مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا۔
- یہودِ مدینہ کے ساتھ آنحضرتؐ نے امن وامان کے ماحول میں وقت بسر کرنے کی کوشش کی لیکن یہودیوں کی سازشوں اور عہد شکنیوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ رہا تو آپؐ نے یہودیوں کے سب سے بڑے مرکز خیبر پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا اور یہود کا زور توڑ دیا۔
- قیصرِ روم کے باج گزاروں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور یہ خبر ملی کہ خود قیصرِ روم مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے تو جناب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں اس کا انتظار کرنے کے بجائے شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کی اور تبوک میں ایک ماہ قیام کر کے رومی فوجوں کا انتظار کرنے کے بعد وہاں سے واپس تشریف لائے۔

یہ تو چند کھلی جنگیں ہیں جو علانیہ لڑی گئیں لیکن ان سے ہٹ کر ایسی متعدّد کارروائیاں بھی سیرۃ النبیؐ کے ریکارڈ میں ملتی ہیں جنہیں چھاپہ مار کارروائیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

- مدینہ منورہ کے ایک سازشی یہودی سردار کعب بن اشرف کو جناب نبی اکرمؐ کے ایما پر حضرت محمد بن مسلمہؓ اور ان کے رفقاء نے شب خون مار کر قتل کیا۔
- خیبر کے نواح کے ایک اور سازشی یہودی سردار ابورافع کو جناب نبی اکرمؐ کے حکم پر حضرت عبداللہ بن عتیکؓ نے اسی قسم کی چھاپہ مار کارروائی کے ذریعے سے قتل کیا۔
- جناب نبی اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں یمن کے اسلامی صوبہ پر ایک مدعی نبوت اسود عنسی نے قبضہ کر کے آنحضرتؐ کے مقرر کردہ گورنر کو شہید کر دیا اور اسلامی ریاست کے عمال کو یمن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو آپؐ کے ایما پر حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء نے چھاپہ مار کارروائی کر کے اسود عنسی کو رات کی تاریکی میں قتل کیا اور یمن پر اسلامی اقتدار کا پرچم دوبارہ لہرا دیا۔
- صلح حدیبیہ میں قریشِ مکہ کی بعض ناجائز اور یکطرفہ شرائط کے خلاف دباؤ ڈالنے کے لیے حضرت ابوبصیرؓ اور حضرت ابوجندلؓ نے سمندر کے کنارے ایک باقاعدہ چھاپہ مار کیمپ قائم کیا اور قریش کا شام کی طرف تجارت کا راستہ غیر محفوظ بنا دیا جس سے مجبور ہو کر قریش کو صلح حدیبیہ کے معاہدے میں شامل اپنی یکطرفہ شرائط واپس لینا پڑیں اور ابوبصیرؓ کی چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آکر قریش کو حضورؐ سے دوبارہ گفتگو کرنا پڑی۔

جناب نبی اکرمؐ نے میدانِ جنگ میں دشمن کے مقابلے کے ساتھ ساتھ میڈیا کے محاذ پر بھی کفار کے خلاف صف آرائی کی۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے بعد حضورؐ نے مدینہ منورہ کے ایک اجتماع میں باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کیا کہ اب قریش مکہ کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوگی لیکن اب وہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور مسلمانوں کے خلاف پورے عرب میں پراپیگنڈے اور منافرت انگیزی کا بازار گرم کریں گے۔ آپؐ نے اس موقع پر شعر و خطابت سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرامؓ کو میدان میں آنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے کھلے بندوں اعلان کر کے یہ محاذ سنبھالا اور شعر و شاعری کے محاذ پر کفار کے حملوں کا پوری جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔

زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے لیکن ان گزارشات سے اتنی بات ضرور سامنے آگئی ہوگی کہ

جناب رسول اللہؐ نے اسلام کی سربلندی اور امتِ مسلمہ کے تحفظ واستحکام کے لیے موقع ومحل کی مناسبت سے جنگ کی ہر ممکنہ صورت اختیار کی۔ اور محاذ آرائی کے جس اسلوب نے بھی آنحضرتؐ کے سامنے اپنا چیلنج رکھا اسے جواب میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

جہاد کے حوالے سے دو سوالات کا جائزہ

آج کے حالات میں جہاد کے حوالے سے دو سوال عام طور پر کیے جاتے ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ اور کیا کسی علاقے میں جہاد کے لیے ایک اسلامی حکومت کا وجود اور اس کی اجازت ضروری نہیں ہے؟

مسلمان مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیاں

اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں حضرت ابوبصیرؓ کا کیمپ اور حضرت فیروز دیلمیؓ کی چھاپہ مار کارروائی میں ہمارے سامنے واضح مثال کے طور پر موجود ہے۔ حضرت ابوبصیرؓ نے اپنا کیمپ حضورؐ کی اجازت سے قائم نہیں کیا تھا لیکن جب یہ کیمپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو آپؐ نے نہ صرف اس کے نتائج کو قبول کیا بلکہ قریش کی طرف سے یکطرفہ شرائط سے دستبرداری کے بعد اس کیمپ کے مجاہدین کو باعزت طور پر واپس بلا لیا۔ اسی طرح یمن پر اسود عنسی کا غیر اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ سے فوج بھیج کر لشکر کشی نہیں کی بلکہ یمن کے اندر مسلمانوں کو بغاوت کرنے کا حکم دیا اور اسی بغاوت کی عملی شکل وہ چھاپہ مار کارروائی تھی جس کے نتیجے میں اسود عنسی قتل ہوا۔

اعلانِ جہاد کیلئے اسلامی حکومت کا وجود

دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر جہاد شرعی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے تو جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں اقلیت کے طور پر رہتے ہیں، ان کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا ان کے لیے جہاد میں شمولیت ضروری نہیں ہے؟ اس کے جواب میں دو واقعات کا حوالہ دینا چاہوں گا:

۱۔ ایک یہ کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ان کے والد محترم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کی خدمت میں جہاد میں شمولیت کے لیے حاضر ہو رہے تھے کہ راستے میں کفار کے ایک گروہ نے گرفتار کر لیا اور اس شرط پر انہوں نے ہمیں رہا کیا ہے کہ ہم ان کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر حصہ نہیں لیں گے۔ اس پر آنحضرتؐ نے یہ فرما کر انہیں بدر کے معرکے میں شریک ہونے سے روک دیا کہ اگر تم نے اس بات کا وعدہ کر لیا ہے تو اس وعدہ کی پاسداری تم پر لازم ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد محترم موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معرکے میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکے تھے۔

۲۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب رسول اکرمؐ قُبا میں قیام فرما تھے اور ابھی مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے لیکن حضرت سلمان فارسیؓ کا ذکر نہ بدر کے مجاہدین میں ملتا ہے اور نہ وہ اُحد ہی میں شریک ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت آزاد نہیں تھے بلکہ ایک یہودی کے غلام تھے، چنانچہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کی شمولیت جس پہلے غزوہ میں ہوئی، وہ اَحزاب کا معرکہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کے معروضی حالات اور ان کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا ہے۔ اس لیے جو مسلمان غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں رہتے ہیں اور ان کے ان ریاستوں کے ساتھ وفاداری کے معاہدات موجود ہیں، ان کے لیے ان معاہدات کی پاسداری لازمی ہے۔ البتہ اپنے ملکوں کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور ہمدردی و خیر خواہی کے لیے وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، وہ ان کی دینی ذمہ داری ہے اور اس میں انہیں کسی درجے میں بھی کوتاہی روا نہیں رکھنی چاہیے۔

گزشتہ سال افغانستان پر امریکی حملے کے موقع پر میں برطانیہ میں تھا۔ مجھ سے وہاں کے بہت سے مسلمانوں نے دریافت کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہودیوں کی پیروی کرنا چاہیے اور ان سے کام کا طریقہ سیکھنا چاہیے کیونکہ یہودی ان ممالک میں رہتے ہوئے جو کچھ یہودیت کے عالمی غلبہ اور اسرائیل کے تحفظ و دفاع کے لیے کر رہے ہیں، اسلام کے غلبہ اور

مظلوم مسلمانوں کے دفاع کے لیے وہ سب کچھ کرنا مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ مگر یہ کام طریقہ اور ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے، اور جن ملکوں میں مسلمان رہ رہے ہیں اُن کے ساتھ اپنے معاہدات اور کمٹمنٹ کے دائرے میں رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کی مغلوبیت کا دور

آج دنیا کی عمومی صورتحال پھر اس سطح پر آگئی ہے کہ خواہشات اور محدود عقل پرستی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور آسمانی تعلیمات کا نام لینے کو جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ آج کی اجتماعی عقل نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے انکار کر کے حاکمیتِ مطلقہ کا منصب خود سنبھال لیا ہے اور وحی الٰہی سے راہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اس کے نشانات واثرات کو ختم کرنے کی ہر سطح پر کوشش ہو رہی ہے۔ اس فضا میں ''اعلاء کلمۃ اللہ'' کا پرچم پھر سے بلند کرنا اگرچہ مشکل بلکہ مشکل تر دکھائی دیتا ہے لیکن جناب نبی اکرمؐ کی سنت وسیرت کا تقاضا یہی ہے کہ نسلِ انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقلِ محض کی پیروی کے فریب سے نکالا جائے اور اسے آسمانی تعلیمات کی ضرورت واہمیت کا احساس دلاتے ہوئے وحی الٰہی کے ہدایات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔

اس کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان جس مظلومیت اور کسمپرسی کے عالم میں ظالم اور متسلط قوتوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہیں اور انہیں جس بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ ان کے مذہبی تشخص کے ساتھ ساتھ قومی آزادی اور علاقائی خود مختاری سے محروم کیا جا رہا ہے، اس کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنا اور ان مظلوم مسلمانوں کو ظلم وجبر کے ماحول سے نجات دلانے کے لیے جو کچھ ممکن ہو، کر گزرنا یہ بھی حضورؐ کی تعلیمات وارشادات کا ایک اہم حصہ ہے جس سے صرفِ نظر کر کے ہم آپؐ کی اتباع اور پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ان دو عظیم ترملّی مقاصد کے لیے جدوجہد کے مختلف شعبے ہیں:

- فکر وفلسفہ کا میدان ہے،
- میڈیا اور انفرمیشن ٹیکنالوجی کی جولان گاہ ہے،
- تہذیب وثقافت کا محاذ ہے،

- تعلیم و تربیت کا دائرہ ہے،
- لابنگ اور سفارت کاری کا شعبہ ہے،
- اور عسکری صلاحیت کے ساتھ ہتھیاروں کی معرکہ آرائی ہے۔

یہ سب جہاد فی سبیل اللہ کے شعبے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ناگزیر تقاضے ہیں۔

آج کے دور میں جہاد کا مفہوم

اس لیے آج کے دور میں "سنتِ نبویؐ کی روشنی میں جہاد کا مفہوم" یہ ہے کہ:

- نسلِ انسانی کو خواہشات کی غلامی اور عقلِ محض کی پیروی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور آسمانی تعلیمات کی عملداری کی طرف لانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔
- اسلام کی دعوت اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو نسلِ انسانی کے ہر فرد تک پہنچانے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق اسے دعوتِ اسلام کا مقصد وافادیت سمجھانے کا اہتمام کیا جائے۔
- ملتِ اسلامیہ کو فکری وحدت، سیاسی مرکزیت، معاشی خود کفالت، ٹیکنالوجی کی مہارت، اور عسکری قوت وصلاحیت کی فراہمی کے لیے بھرپور وسائل اور توانائیاں بروئے کار لائی جائیں۔
- مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے اخلاق وکردار کی تعمیر کے لیے تگ ودو کی جائے، نیز دینی تعلیم وتربیت کے نظام کو ہر سطح پر مربوط ومنظم کیا جائے۔
- مظلوم مسلمانوں کو ظلم وجبر سے نجات دلانے اور ان کے دینی تشخص اور علاقائی خود مختاری کی بحالی کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔
- مسلم ممالک میں قرآن وسنت کی عملداری اور شرعی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کر کے تمام مسلم ملکوں کو عالمی سطح پر کنفیڈریشن کی صورت میں خلافتِ اسلامیہ قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔
- دینی جذبہ وغیرت کے تحت ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں ہتھیار اٹھانے والے مجاہدین کو عالمی استعمار کے ہاتھوں ذبح کرانے اور ان کے قتلِ عام پر خوش ہونے کے

بجائے ان کو بچانے کی کوشش کی جائے۔ اور اس عظیم قوت کو ضائع ہونے سے بچانے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرتے ہوئے انہیں ملتِ اسلامیہ کے لیے حقیقی معنوں میں ایک کارآمد قوت بنانے کی راہ نکالی جائے۔

- اسلامی تعلیمات، قرآن وسنت کے قوانین اور جہاد کے بارے میں عالمی استعمار اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے طرفہ اور معاندانہ پروپیگنڈے سے متاثر ومرعوب ہونے کے بجائے اس کو مسترد کیا جائے، اور دلیل ومنطق کے ساتھ اسلامی احکام اور جہاد کی ضرورت وافادیت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔

یہ کام دراصل مسلم حکومتوں کے کرنے کے ہیں اور انہیں او آئی سی (مسلم سربراہ کانفرنس) کے عملی ایجنڈے کا حصہ ہونا چاہیے، لیکن اگر دینی مراکز اور اسلامی تحریکات بھی باہمی ربط ومشاورت کے ساتھ ان مقاصد کے لیے مشترکہ پیشرفت کا اہتمام کر سکیں تو حالات کو خاصا بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

اتحادِ اُمت، اُسوۂ نبوی ﷺ کی روشنی میں

(۱۱اپریل ۲۰۰۶ء کو ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی لاہور کی دعوت پر فیز تھری کی مسجد میں ربیع الاول کی بارہویں شب کو ''سرورِ کائنات اور اتحادِ بین المسلمین'' کے عنوان پر خطاب۔ مطبوعہ روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۷اپریل ۲۰۰۶ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو پر کچھ عرض کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آقائے نامدار امتِ مسلمہ کے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہیں۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس ہمیشہ مسلمانوں کی وحدت کا مرکز رہی ہے، آج بھی امت آپؐ کی ذات پر مجتمع ہے، اور قیامت تک آپؐ تمام مسلمانوں کی یکساں عقیدت واطاعت کا مرکز رہیں گے۔ اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے میں وقت کے اختصار کے باعث صرف تین حوالوں سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا:

۱۔ اتحاد کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟

۲۔ مسلمانوں کو آپس میں متحد رکھنے کے لیے جناب نبی اکرمؐ نے جن سینکڑوں ارشادات گرامی میں تلقین فرمائی ہے ان میں سے چند ارشادات نبویؐ کا ذکر کروں گا۔

۳۔ توہین رسالتؐ کے اخباری خاکوں کی اشاعت کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں نے اجتماعی طور پر جناب رسول اللہؐ کے ساتھ جس شدت سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے رسول اکرمؐ کی ذات گرامی ایک بار پھر مسلمانوں کی وحدت واجتماعیت کے مرکزی نکتے کے طور پر دنیا کے سامنے آئی ہے، اس بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

اتحاد کا مطلب اور اس کے تقاضے

پہلی بات یہ کہ اتحاد کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی قوم

کے درمیان اختلافات پیدا نہ ہونے کو اتحاد کہا جاتا ہے۔ یعنی اتحاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اوّل تو اختلاف پیدا نہ ہو اور اگر کسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جائے تو یہ اتحاد ختم ہو جائے۔

اختلاف اور تفرقہ کا فرق

میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں، کیونکہ

- اختلاف ایک فطری امر ہے، جہاں بھی انسان باہم اکٹھے ہوں گے ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوگا، یہ عقل و فطرت کا تقاضہ ہے اور اسلام اس کی نفی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل و فہم کے مختلف درجات سے نوازا ہے، مزاج الگ الگ ہیں، اور نفسیات میں بے پناہ تفاوت ہے، اس لیے اختلاف پیدا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
- اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ اختلاف اگر پیدا ہوگا تو وہ باقی بھی رہے گا۔ ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اختلاف اور چیز ہے جبکہ تفرقہ اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے اختلاف سے کسی جگہ بھی منع نہیں کیا البتہ تفرقہ سے منع کیا ہے۔

چنانچہ اتحاد بین المسلمین پر گفتگو کرتے ہوئے میں اس نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں اور اس سلسلے میں نبی اکرمؐ کے بیسیوں ارشادات میں سے دو کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

حضرت عمرؓ کے دو واقعات

بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسجد نبویؐ میں ایک صاحب نماز پڑھ رہے تھے جس میں وہ بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی جو اس طرح نہیں تھی جس طرح حضرت عمرؓ نے جناب رسول اللہؐ سے پڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ چونکہ وہ میرے حساب سے قرآن کریم کی آیت غلط پڑھ رہا تھا اس لیے مجھے سخت غصہ آیا، قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے دبوچ لیتا مگر میں نے صبر کیا اور اس کے نماز مکمل کرنے کا انتظار کیا۔ جونہی اس نے نماز مکمل کی میں نے اس کے گلے میں چادر ڈالی اور کھینچتا ہوا اسے جناب رسول اللہؐ کے پاس لے گیا کہ یا رسول اللہ! یہ شخص نماز میں قرآن کریم غلط پڑھ رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا

کہ پہلے اس کی گردن تو چھوڑو، میں نے اسے چھوڑ دیا تو آپؐ نے اس سے فرمایا کہ وہ آیت جس طرح تم پڑھ رہے تھے اب پڑھ کر سناؤ۔ اس نے سنا دی۔ پھر مجھے فرمایا کہ جس طرح تمہیں یاد ہے تم سناؤ۔ میں نے بھی سنا دی۔ اس پر نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اس نے بھی ٹھیک پڑھا ہے اور تم نے بھی درست پڑھا ہے۔

یہ دراصل قراءتوں کا اختلاف تھا۔ کسی بھی زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا تلفظ اور لہجہ علاقوں اور قوموں کے فرق سے بدل جاتا ہے لیکن معنٰی ایک ہی رہتا ہے۔ لفظ بھی بنیادی طور پر وہی ہوتا ہے لیکن لہجہ اور تلفظ بدل جاتا ہے اور بعض اوقات سپیلنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ میں مثال کے طور پر پنجابی کے ایک لفظ کا حوالہ دوں گا کہ ہمارے ہاں کسی کام کی کیفیت پوچھنے کے لیے ''کیویں'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے مختلف تلفظ میں کہیں یہ لفظ کیویں ہے، کہیں کداں ہے، کہیں کیکن ہے، کہیں کنجو ہے، اور کسی علاقے میں اسے کیاں کے تلفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ یعنی لفظ اور معنٰی ایک ہی ہے لیکن تلفظ اور ادائیگی مختلف ہے۔ یہ زبان پر علاقائی اثرات ہوتے ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اسے قریش کے لہجے اور تلفظ میں پڑھنے کی پابندی تھی۔ آپؐ نے بارگاہ ایزدی میں خود درخواست کی کہ ایک ہی لہجے اور تلفظ کا سب عربوں کو پابند بنانے سے بہت سے عرب قبائل کو قرآن کریم پڑھنے میں دقت پیش آسکتی ہے اس لیے اس معاملے میں سہولت پیدا کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری استدعا پر اللہ تعالٰی نے قرآن کریم کو سات مختلف لہجوں اور قراءتوں میں پڑھنے کی اجازت دے دی تاکہ تمام لہجوں اور قراءتوں کے ساتھ لوگ آسانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر سکیں۔ اب یہ اختلاف ایسا ہے جو آنحضرتؐ نے خود مانگ کر لیا ہے اس لیے کہ یہ فطری ضرورت تھا۔

دوسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے مستقل الگ وضو فرماتے تھے، لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ایک ہی وضو کے ساتھ پورے دن کی نمازیں پڑھ ڈالیں۔ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے آج ایسا کام کیا ہے جو اس سے پہلے آپ نہیں کیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں نے جان بوجھ

کر ایسا کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے الگ وضو کرنا اگرچہ بہت اجر و ثواب کی بات ہے لیکن اس کی پابندی سے بہت سے لوگوں کو دِقّت ہوگی۔ اس لیے حضورؐ نے ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں ادا کر کے اسے بھی سنت میں شامل فرمالیا تاکہ کسی کو ایسا کرتے ہوئے کوئی الجھن نہ ہو۔

یہ صرف ایک مثال میں نے ذکر کی ہے اس طرح کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک کام کو جناب رسول اللہؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے انجام دیا تاکہ طریقوں میں تنوع ہو اور لوگوں کو اپنی سہولت کے مطابق ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کرنے میں یہ پریشانی نہ ہو کہ حضورؐ نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ اسلام نے اختلاف کی نفی نہیں کی بلکہ اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا احترام کیا ہے اور اسے برقرار رکھا ہے۔

اختلاف کی حدود کا تعیّن

البتہ اسلام نے اختلاف کی حدود کا تعیّن کیا ہے اور ہر اختلاف کو اس کے دائرے میں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

(۱) اختلاف کی حدود میں پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ جہاں اختلاف کی گنجائش ہو وہاں اختلاف کیا جائے اور جہاں اختلاف کی گنجائش نہ ہو وہاں اختلاف کرنے سے گریز کیا جائے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے بریرہؓ کے ایک واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی باندی بریرہؓ کو آزاد کر دیا تو وہ ایک صحابی مغیثؓ کے نکاح میں تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر بریرہؓ کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اگر مغیثؓ کے نکاح میں نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ بریرہؓ نے ایسا ہی کیا اور مغیثؓ سے نکاح ختم کر لیا۔ اس پر مغیثؓ کو پریشانی ہوئی اور اس نے مختلف اطراف سے بریرہؓ کو واپسی پر آمادہ کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق مغیثؓ کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ وہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھومتے رہتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منالائے؟

حضورؐ نے یہ صورتحال دیکھ کر خود بریرہؓ سے بات کی اور اس بارے میں اس سے پوچھا۔ بریرہؓ نے جواب دیا کہ یہ میرا شرعی حق تھا جو میں نے استعمال کیا ہے کیونکہ میں مغیثؓ کے نکاح میں نہیں رہنا

چاہتی۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم اپنا یہ فیصلہ واپس نہیں لے سکتیں؟ اس نے بڑے ادب سے پوچھا کہ یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ بڑی سمجھدار خاتون تھی، اور کیسے نہ ہوتی کہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہ رہی تھی۔ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اس نے یہ سوال کرکے ایک حدِفاصل قائم کر دی کہ جناب نبی اکرمؐ کے کسی حکم کو نہ ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ مشورہ کی صورت میں اختیار باقی رہتا ہے۔ جب حضورؐ نے فرمایا کہ میں حکم نہیں دے رہا بلکہ مشورہ دے رہا ہوں تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میں اپنے فیصلہ پر قائم ہوں اور مجھے مغیثؓ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر جگہ اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی اور اختلاف وہیں کیا جا سکتا ہے جہاں اس کی گنجائش ہو۔ مثلاً قرآن کریم کے کسی حکم کو سمجھنے اور اس کا مصداق طے کرنے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن نفسِ حکم سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد اور عمل کا مفہوم و منشا متعیّن کرنے میں تو اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ارشاد و عمل سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لہٰذا اختلاف کی حدود میں پہلی بات یہ ضروری ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ کہاں اختلاف کی گنجائش ہے اور کہاں نہیں ہے۔

(۲) اس سلسلے میں دوسری بات یہ ضروری ہے کہ ہر اختلاف کو اپنی سطح پر اور اپنے درجہ میں رکھا جائے۔ ہمارے ہاں اختلاف پر ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ بازی کا جو رجحان زور پکڑ گیا ہے یہ درست نہیں ہے۔ ہر اختلاف کفر و اسلام کا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر اختلاف حلال و حرام کا ہوتا ہے۔ بعض جگہ صرف اولیٰ و غیر اولیٰ اور ترجیحات کا اختلاف ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں فتویٰ بازی ہر اختلاف کے حوالے سے یکساں ہوتی ہے جس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اور اس رجحان پر قابو پانا وحدتِ اُمت کے لیے آج کے دور کا سب سے بڑا تقاضہ ہے۔

اس سلسلہ میں جناب نبی اکرمؐ کے ایک ارشادِ گرامی کا حوالہ دوں گا جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کو کافر کہا اگر وہ کافر نہ ہو تو کفر کا فتویٰ کافر کہنے والے پر واپس لوٹ آئے گا۔ اور جس شخص نے کسی مسلمان پر لعنت بھیجی ہے جبکہ وہ لعنت کا مستحق نہیں تو یہ لعنت بھیجنے والے پر

واپس آئے گی۔

یہی فتوے ہمارے ہاں سب سے بڑے فتوے شمار ہوتے ہیں جن کی اہمیت اور نزاکت جناب نبی اکرمؐ نے ان ارشادات گرامی میں بیان فرمائی ہے۔ اگر اختلافات کی حدود کو قائم رکھا جائے اور بلاوجہ فتویٰ بازی سے گریز کر کے ہر اختلاف کو اس کی سطح پر اور اس کے دائرے میں محدود رکھا جائے تو یہ اختلاف امت کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ یہ اختلافات نہ صرف فطرت کا تقاضہ اور رحمت ہیں بلکہ ہماری معاشرتی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔

وحدتِ اُمت کے لیے آنحضرتؐ کے ارشادات

اس کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے بہت سے ارشادات میں ہمیں باہمی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

جاہلی روایات کا خاتمہ

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں جناب رسالت مآبؐ نے دور جاہلیت کے خاتمے کا اعلان کر کے اسلام اور روشنی کے دور کا آغاز کیا اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ کل امر الجاہلیۃ تحت موضوع قدمی کہ جاہلیت کی تمام اقدار آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ ان میں شرکت وبدعت، نسل پرستی، زبان ورنگ کا امتیاز، بدکاری، شراب، جوا، سود، کہانت ونجوم، ناچ گانا، عریانی، اور باہمی قتل وقتال کی جاہلی اقدار شامل تھیں، جنہیں جناب رسول اللہؐ نے تیئیس سالہ محنت کے ساتھ ختم کیا اور ان جاہلی اقدار سے پاک اسلامی معاشرے کا آغاز فرمایا۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ آج یہ تمام اقدار ایک ایک کر کے پھر ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان روایات کا ابوجہل، ابولہب، نضر بن حارث، اور دیگر کافر سرداروں کے حوالے سے ذکر کیا جاتا ہے تو وہ جاہلی اقدار کہلاتی ہیں، جبکہ وہی اقدار ہماری سوسائٹی کا حصہ بنتی ہیں تو تمدن، سولائزیشن، ترقی، یا آرٹ کا عنوان اختیار کر لیتی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ نے اپنے خطبے میں ہمیں اس بات کی تلقین بھی فرمائی تھی کہ

میرے بعد کفر و جاہلیت کے دور کی طرف واپس نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا اور باہمی قتل و قتال کسی بھی عنوان سے ہو، اسے جناب رسول اللہؐ نے کفر و جاہلیت سے تعبیر کیا ہے۔ جبکہ ایک حدیث میں اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ایک صورت قرار دیا ہے۔

امت کیلئے دعائیں اور پیشگوئیاں

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے چار باتوں کا سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے تین چیزیں عطا فرمائیں لیکن ایک نہیں دی:

۱۔ میں نے سوال کیا کہ میری امت پر مجموعی طور پر پہلی امتوں جیسا عذاب نازل نہ ہو، یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔

۲۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت یکبارگی گمراہی کا شکار نہ ہو، یہ بات بھی قبول کر لی گئی۔

۳۔ میں نے گزارش کی کہ میری امت ساری کی ساری یکبارگی تباہ نہ ہو، یہ بات بھی قبول ہوگئی۔

۴۔ میں نے عرض کیا کہ میری امت آپس میں نہ لڑے تو یہ بات اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔

جبکہ ایک اور حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت پر جب اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا تو اس کی عملی صورتیں تین ہوں گی:

۱۔ ایک یہ کہ میری امت کے لوگ آپس میں لڑیں گے اور ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ امت کے شریر لوگوں کو ان پر مسلط کر دیں گے۔

۳۔ اور تیسرا یہ کہ امت کے نیک لوگوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوں گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ یعنی آنکھ کو تکلیف ہو تو سارا جسم اسے محسوس کرتا ہے اور اگر پاؤں کو کو درد تو جسم کے سارے اعضاء اسے محسوس کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس لیے کوئی مسلمان نہ اپنے دوسرے بھائی پر خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے ظلم کے لیے کسی دوسرے کے حوالے کرتا ہے۔

ان ارشادات نبویؐ کی روشنی میں دیکھا جائے تو امت کے موجودہ افتراق کے اسباب کو تلاش کرنا

کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ آج کے دور کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم امت کے افتراق کے اصل اسباب کو تلاش کریں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ آنحضرتؐ نے ہمیں اسی کی تلقین فرمائی ہے اور اس حوالے سے ہماری یہی دینی و ملی ذمہ داری ہے۔

توہینِ رسالت کے خاکے اور امتِ مسلمہ کا اجتماعی ردِ عمل

اس کے بعد میں گفتگو کے آخری نکتے کی طرف آتا ہوں کہ ہماری تمام تر خرابیوں، کمزوریوں، اور بداعمالیوں کے باوجود توہینِ رسالتؐ کے خلاف عالمِ اسلام کے حالیہ اجتماعی احتجاج سے ایک بار پھر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان وحدت واتحاد کا مرکزی نکتہ آج بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ یہ بات جہاں حضورؐ کی کا اعجاز اور اسلام کی صداقت کا اظہار ہے وہاں اس بات کی بھی علامت ہے کہ مسلمانوں کے ایمان کا کنکشن آج بھی قائم ہے، یہ کنکشن درست ہے اور اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ البتہ ہمارے ''سیٹوں'' میں کمزوری ہے، اگر ہم اپنے اپنے سیٹ ٹھیک کرلیں اور ان کی خرابیوں کو دور کر لیں تو حضورؐ کی عقیدت کا کنکشن آج بھی ''اسٹیبل'' ہے اور اس کی برکتیں اور بہاریں بدستور تازہ ہیں۔

یورپ کے بعض اخبارات نے تو یقیناً یہ کارروائی شر کے خیال سے کی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں سے خیر کا یہ پہلو نکال دیا ہے کہ حضرت محمدؐ کے ساتھ مسلمانانِ عالم کی بے لچک کمٹمنٹ کا ایک بار پھر اظہار ہوگیا ہے اور مغرب کو اس تکلیف دہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ اس نے گزشتہ تین صدیوں کے درمیان مسلمانوں کی کمٹمنٹ کے مراکز تبدیل کرنے کی جو محنت کی تھی وہ رائیگاں جا رہی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی کمٹمنٹس کی ترجیحات میں آج بھی سرفہرست اسلام اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، باقی تمام کمٹمنٹس کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یہ حضورؐ کی ذات گرامی، سیرتِ مبارکہ، اور تعلیمات کا وہ اعجاز ہے جس کا مشاہدہ ہم جیسے گئے گزرے مسلمان بھی کر رہے ہیں اور ساری دنیا اس منظر کو دیکھ رہی ہے۔ اس لیے ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آج کے دور میں ہمارے لیے یہی پیغام ہے کہ اپنی اصل کی طرف واپس پلٹیں اور آپؐ کی سیرت و اسوۂ حسنہ سے روشنی حاصل کر کے اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگیوں کا جزو بنالیں۔

خصائل نبوی ﷺ احادیث نبویؐ کی روشنی میں

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۶ فروری ۲۰۱۱ء)

محدثینِ کرامؒ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اوصاف و کمالات اور معمولات کو علمِ حدیث کے ایک مستقل شعبے کی صورت میں مرتب کیا ہے جسے ''شمائلِ نبویؐ'' کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ بعض محدثین نے اس پر الگ کتابیں لکھی ہیں اور باذوق اہلِ علم نے بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے حسن و ذوق کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کی اجتماعی، معاشرتی، اور علمی و عملی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ذاتی زندگی کی جزئیات تک روایت کی ہیں جنہیں محدثین کرام نے حدیث کے مستقل ابواب کی صورت میں جمع کر کے قیامت تک امتِ مسلمہ کی رہنمائی کا اہتمام کر دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذوق

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تو ذوق ہی یہ تھا کہ وہ ہر کام اسی ترتیب اور جزئیات کی پاسداری کے ساتھ کرتے تھے جس طرح حضورؐ نے وہ کام کیا تھا۔ جناب رسول اللہؐ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا تھا جو ''حجۃ الوداع'' کہلاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس حج میں حضورؐ کے ساتھ تھے اور انہوں نے اس سفر کے آنے جانے کی تفصیلات اس جزرسی کے ساتھ یاد کر رکھی تھیں کہ باقی صحابہ کرامؓ اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کے بعد زندگی بھر ہر سال حج کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ کیا جیسے حضورؐ کے ساتھ کیا تھا۔ جہاں سے آپؐ نے احرام باندھا وہیں سے وہ احرام باندھتے تھے، جہاں آپؐ نے پہلی رات قیام فرمایا وہیں پہلی رات قیام فرماتے تھے، جہاں آپؐ نے دوسرے روز ظہر کی نماز پڑھی وہیں نماز پڑھتے۔ حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق عبداللہ بن عمرؓ اس مبارک سفر

کے دوران پیشاب بھی اسی جگہ کرتے تھے جہاں انہوں نے آپؐ کو پیشاب کرتے دیکھا تھا۔ منٰی میں وہ اسی جگہ خیمہ لگاتے جہاں حضورؐ کا خیمہ حجۃ الوداع میں نصب تھا اور قربانی بھی اسی جگہ کرتے تھے جہاں آپؐ نے قربانی کے جانور ذبح کیے تھے۔

ایک صاحب نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ ہم آپ کو بعض کام بڑے اہتمام سے کرتا دیکھتے ہیں مگر باقی صحابہ کرامؓ وہ کام ویسے نہیں کرتے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو ہر کام اسی انداز اور ترتیب سے کرتا ہوں جس طرح میں نے جناب رسول اللہؐ کو وہ کام کرتے دیکھا ہے۔

اس قدر جزرسی اور تفصیلات اگرچہ ضروری نہیں ہیں مگر جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ حد درجہ محبت و عقیدت کی علامت ضرور ہیں۔ کیونکہ محبوب کی ہر ادا اور ہر چیز محبت کرنے والے کو محبوب ہوتی ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی طرح ہو جائے اور اس کی ہر ادا کو اپنا لے۔ اس کی ایک جھلک ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں کہ ہمارے بچے کھلاڑیوں کو کھیلتے دیکھتے ہیں تو جس کھلاڑی کی کوئی ادا کسی نوجوان کو پسند آجاتی ہے وہ اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً کرکٹ کے حوالے سے آپ کو اپنے ماحول میں کئی چھوٹے چھوٹے میانداد نظر آئیں گے، کئی عمران خان ملیں گے، اور کئی شاہد آفریدی دکھائی دیں گے۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں لیکن بیٹ ایسے پکڑیں گے جیسے جاوید میانداد پکڑتے ہیں، گیند ایسے کرائیں گے جیسے عمران خان کراتے رہے ہیں، اور ایکشن ایسے لیں گے جیسے انہیں شاہد آفریدی کا ایکشن دکھائی دیتا ہے۔ یہ پسند کی علامت ہے، محبت کا اظہار ہے، اور دل میں بس جانے کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذوق بھی یہی تھا اور وہ اس معاملے میں تمام صحابہ کرامؓ میں امتیازی شان رکھتے تھے۔

جناب رسول اللہؐ کے ذاتی اوصاف و خصائل اور معمولات پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث محدثین کرامؒ نے روایت کی ہیں جن میں بطور نمونہ چند ایک کا تذکرہ کرنے کی سعادت ہم حاصل کر رہے ہیں، اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اس ذکر کی برکت سے اس ذوق کا کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب فرما دیں جو قیامت کے روز حضورؐ کی شفاعت اور ان کے ساتھ قربت کا ذریعہ بن جائے، آمین یارب العالمین۔

نبی اکرمؐ کے پسندیدہ خصائل

- ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کو انسانی خِصال میں سے سب سے زیادہ نفرت جھوٹ سے تھی (بیہقی)۔ اور اپنے خاندان کے کسی شخص کے بارے میں جھوٹ کی کسی بات پر مطلع ہوتے تو اس سے اس وقت تک اعراض فرماتے تھے جب تک اس کی توبہ مشاہدے میں نہ آجاتی (مسند احمد)۔
- حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کسی شخص کو کسی علاقے کا حاکم بناکر بھیجتے تو یہ نصیحت بطور خاص فرماتے تھے کہ لوگوں سے انہیں قریب لانے والی باتیں کرنا، دور کرنے والی باتوں سے گریز کرنا۔ آسانی والی بات کرنا، مشکل اور تنگی والی بات نہ کرنا (ابوداؤد)۔
- حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ جب کسی سے بیعت لیتے اور کسی کام کے کرنے کا عہد لیتے تو اس عہد میں یہ گنجائش رکھنے کی تلقین فرماتے کہ فیما استطعت کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا اطاعت کروں گا (مسند احمد)۔
- حضرت ابو امامہؓ فرماتے تھے کہ جناب رسول اللہؐ کسی کو امیر (حاکم) بناکر بھیجتے تو یہ تلقین فرماتے کہ تقریر مختصر کرنا اور باتیں تھوڑی کرنا اس لیے کہ کلام میں تبھی جادو جیسی تاثیر ہوتی ہے (طبرانی)۔ ایک طالب علم کے طور پر اس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضورؐ حاکموں سے فرمارہے ہیں کہ لوگوں کو اپنی جادو بیانی اور گفتگو کے سحر میں ہی نہ جکڑے رکھنا بلکہ ان کے مفاد کے عملی کاموں کو ترجیح دینا۔
- حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ جب کسی ساتھی کو رخصت کرتے تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے اور اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ خود ہاتھ نہ چھوڑتا، اور اسے رخصت کرتے وقت دعا سے بھی نوازتے (مسند احمد)۔
- حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ سب لوگوں سے زیادہ خوش مزاج اور سب سے زیادہ مسکرانے والے تھے (طبرانی)۔
- حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ جب بھی گفتگو فرماتے، مسکراہٹ آپ

کے چہرے پر نظر آتی تھی۔ (مسند احمد)۔

- حضرت حنظلہ بن خدیمؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کسی شخص کو بلاتے تو اس کے پسندیدہ نام اور کنیت کے ساتھ اس کو پکارتے (طبرانی)۔
- حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ اکثر اوقات اپنے سر مبارک کو ڈھانپ کر رکھتے یعنی سر پر اکثر کپڑا ہوتا تھا (ترمذی)۔
- حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے، بے مقصد بات نہ کرتے، نماز لمبی پڑھتے، اور خطبہ مختصر ارشاد فرماتے۔ آپؐ کسی بات پر ناک نہیں چڑھاتے تھے اور کسی بیوہ، یتیم یا غلام کے ساتھ اس کے کام کے لیے چلنے میں تکبر نہیں کرتے تھے اور جب تک اس کا کام نہیں ہو جاتا تھا ساتھ رہتے تھے (مستدرک حاکم)۔
- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہؐ اپنے کام اکثر خود کر لیتے تھے۔ کپڑے کو ٹانکا لگا لیتے، بکری کا دودھ دوہ لیتے، اور ذاتی خدمت کے کام بھی خود کر لیتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ دوسرے روز کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں رکھتے تھے اور جو کچھ ہوتا اسی روز خرچ کر ڈالتے تھے (ترمذی)۔
- حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے پاس اُحد پہاڑ جتنا سونا بھی ہو تو میں اپنے پاس تین دینار سے زیادہ ذخیرہ نہیں رکھوں گا اور سب کا سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دوں گا (بخاری شریف)۔
- حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ کی خوراک بہت کم تھی۔ وہ اگر دوپہر کا کھانا کھاتے تو رات کا نہیں کھاتے تھے اور رات کا کھانا کھا لیتے تو دوپہر کا نہیں کھاتے تھے (حلیہ)۔
- جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خادموں سے پوچھتے رہتے تھے کہ تمہاری کوئی ضرورت تو نہیں؟ تمہیں کوئی کام تو نہیں؟ (مسند احمد)۔ گویا حضورؐ اپنے خادموں کی ضروریات کا بھی بطور خاص خیال رکھتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی ان خصائلِ مبارکہ کو اپنانے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

علاج معالجہ اور اسوۂ نبوی ﷺ

(۱۹ دسمبر ۲۰۱۱ء کو ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب معالجِ خصوصی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی دعوت پر روٹری کلب کے زیر اہتمام گوجرانوالہ میں ایک سیمینار سے خطاب۔ مطبوعہ روزنامہ پاکستان، لاہور۔ یکم جنوری ۲۰۱۲ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ علاج معالجہ اور اس کے لیے ریسرچ، محنت اور فکر مندی انسانی ضرورت ہے، سوسائٹی کا تقاضا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ بھی ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی بیماریوں کے علاج معالجے کی تلقین فرمائی ہے۔ اور آپؐ نے بیماریوں کے لیے جسمانی و روحانی دونوں طرز کے علاج خود بھی تجویز کیے ہیں، اس لیے انسانی بیماریوں کا علاج انسانی خدمت ہونے کے ناتے عبادت اور سنتِ رسولؐ بھی شمار ہوتا ہے۔

اسی طرح عام سطح پر محسوس کیے جانے والے خدشات کا لحاظ رکھنا بھی آنحضرتؐ کی سنتِ مبارکہ ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب رسول اللہؐ نے عام لوگوں سے سنا کہ جب بچہ ماں کا دودھ پی رہا ہو تو اس دوران میاں بیوی کا ہم بستری کرنا بچے کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اسے عربی میں "غیلہ" کہتے ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے اس عمل پر پابندی لگا دی۔ لیکن بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ عمومی تاثر درست نہیں ہے تو آپؐ نے یہ کہہ کر غیلہ پر پابندی ختم کر دی کہ مجھے پہلے جو بتایا گیا تھا وہ درست نہیں تھا اس لیے میں اس پابندی کو ختم کر رہا ہوں۔

چنانچہ کسی چیز کے بارے میں کوئی تاثر عام ہو جائے تو اس کا نوٹس لینا چاہیے اور تحقیق کے بعد اگر وہ غلط ثابت ہو جائے تو اس تاثر کو ختم کرنے کی کارروائی بھی کرنی چاہیے۔ اس لیے جو لوگ پولیو مہم کے بارے میں کسی شک و شبہ کا شکار ہیں انہیں تحقیق کے علاوہ متعلقہ ماہرین سے رجوع کرنا چاہیے اور بلا تحقیق کسی عوامی تاثر کو پھیلانے سے گریز کرنا چاہیے۔

پولیو کی مہم میں بچوں کو قطرے پلائے جاتے ہیں اور بچے دوائی خوش دلی سے نہیں پیتے بلکہ بسا

اوقات مزاحمت کرتے ہیں۔ اس حوالے سے جناب نبی اکرمؐ کا ایک دلچسپ واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ آخری ایام میں جب نبی اکرمؐ زیادہ بیمار ہوئے تو کمزوری بڑھنے لگی۔ ایک دن جب آپؐ ایسی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے کہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہے تھے لیکن بولنے اور کسی کام سے روکنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اس دوران گھر والوں نے آپؐ کو دوائی پلانا چاہی تو آپؐ نے اشاروں سے منع کیا۔ مگر گھر کی خواتین نے منع کرنے کے باوجود زبردستی آپؐ کے منہ میں دوائی ڈال دی۔ حضورؐ کو جب افاقہ ہوا تو گھر والوں سے پوچھا کہ میں نے جب منع کیا تھا تو آپ لوگوں نے مجھے زبردستی دوائی کیوں پلائی؟ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! مریض تو ایسی دوائی سے روکتا ہی ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم سب کو باری باری اسی طرح دوائی پلائی جائے، اس لیے ہر ایک کو باری باری جکڑ کر اس کے منہ میں دوائی ڈالو۔ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ انہیں نہ پلائی جائے کہ وہ اس عمل میں شریک نہیں تھے۔ چنانچہ آپؐ کے حکم پر سب کو باری باری جکڑ کر یہ دوائی پلائی گئی۔

بعض دوسری روایات میں ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے اس موقع پر عرض کیا کہ میں (نفلی) روزے سے ہوں۔ مگر آپؐ نے فرمایا کوئی بات نہیں اس کو بھی ابھی اسی طرح دوائی پلاؤ۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے چچا عباسؓ کے بارے میں یہ فرمایا کہ انہیں نہ پلائیں کہ وہ اس عمل میں شریک نہیں تھے۔ حالانکہ وہ اگرچہ اس کارروائی میں عملاً شریک نہیں تھے مگر ازواج مطہراتؓ کو انہوں نے ہی آپؐ کو زبردستی دوائی پلانے کے لیے کہا تھا۔

بہرحال علاج معالجہ اور اس کی ضروریات و تقاضوں کو پورا کرنا سنت نبویؐ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات آج کی اس محفل میں شریک اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنے دور کی سب سے بڑی طبیبہ بھی تھیں۔ ان کے بھانجے حضرت عروۃ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ، جو خود بھی تابعین کے دور کے بڑے محدث اور فقیہ ہیں، کہ میں نے اپنے دور میں قرآن کریم کی تفسیر، حدیث و سنت، شعر و ادب، قبائل کے انساب و تاریخ، اور طب میں حضرت عائشہؓ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ حضرت عروہؓ نے ایک دن پوچھ لیا کہ خالہ جان! یہ طب آپ نے کہاں سے سیکھ لی ہے؟ فرمایا کہ رسول اللہؐ جب بیمار ہوتے تھے تو میں ان کے علاج کے لیے زیادہ فکرمند ہوتی تھی اور مختلف

طبیبوں سے پوچھ کر علاج کرتی تھی، اس سے مجھے علاج معالجے کے بارے میں خاصی معلومات اور تجربہ حاصل ہوگیا۔

معاشرے میں پھیلنے والی بیماریوں کی نشاندہی کرنا، ان کے اسباب معلوم کرنا، ان کے سدباب کی صورتیں نکالنا، اور عوام میں حکمت اور علاج کے بارے میں شعور بیدار کرنا بھی علاج معالجہ کے تقاضے ہیں۔ اور اس کے لیے خلوص کے ساتھ کوشش کرنے والے افراد اور ادارے اس کارِ خیر پر جہاں قابلِ تحسین ہیں وہاں ان سے ہر ممکن تعاون کرنا ہماری قومی اور دینی ذمہ داری بھی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا معاشرتی رویہ اور روزمرّہ معمولات

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۳فروری ۲۰۱۲ء)

امام ترمذیؒ نے ''شمائلِ ترمذی''میں سیدنا حضرت امام حسینؓ سے روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزمرّہ کے معمولات اور شب و روز کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے اپنے سوال کو تین حصوں میں تقسیم کیا: گھر کے اندر جناب رسول اللہؐ جو وقت گزارتے تھے اس کی ترتیب کیا تھی؟ گھر سے باہر کے معمولات اور انداز کیا تھا؟ مجلسی زندگی کے آداب اور انداز کیا تھا؟

گھریلو مجلس

حضرت علیؓ نے بتایا کہ آنحضرتؐ نے اپنے گھر کے اوقات اور معمولات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وقت کا ایک حصہ اپنے ذاتی کاموں پر صرف کرتے تھے، دوسرا حصہ گھر والوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا، اور تیسرا حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہوتا تھا۔

حضورؐ اپنے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص وقت میں ان خواص کے ساتھ ملاقات بھی کرتے تھے جو آپؐ کی خدمت میں گھر میں حاضر ہوتے تھے اور آپؐ کی مخصوص مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ مجلس روزانہ ہوتی تھی، کوئی ضرورت مند ہوتا تو وہ اپنا سوال لے کر آتا اور حضورؐ حسبِ موقع اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ آپؐ اس مجلس کے شرکاء کے ساتھ امت کے اجتماعی مسائل پر گفتگو فرماتے اور عام لوگوں کے معاملات میں ہدایات دیتے تھے۔

آپؐ نے مجلس میں خاص طور پر دو باتوں کی تلقین فرما رکھی تھی کہ مسلمانوں کے عمومی مفاد اور مصلحت کی کوئی بات ہو تو اسے دیگر لوگوں تک پہنچاؤ، اور یہ کہ کوئی شخص اپنی ضرورت اور حاجت کو

حضورؐ تک براہ راست پہنچانے میں کوئی دقت یا حجاب محسوس کرتا ہو تو اس کا مسئلہ آپؐ تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلہ میں حضورؐ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی ضرورت اور مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے کا موقع نہیں پاتا، اس کا مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچانے والے مسلمان کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ثابت قدمی عطا فرمائیں گے۔

مجلس میں آنے والے جو لوگ سوالی ہو کر آتے تھے حضورؐ کے گھر سے کوئی چیز چکھے بغیر واپس نہیں جاتے تھے۔ اس مجلس میں آپؐ کے ساتھ شریک ہونے والے بہترین افراد ہوتے تھے جو مجلس سے باہر کے لوگوں کے لیے رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ مجلس اسی قسم کی باتوں پر مشتمل ہوتی تھی اور ان سے ہٹ کر کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

عمومی مجالس

گھر سے باہر کی عمومی مجالس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ

- جناب نبی اکرمؐ مجلس کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ کرتے تھے اور مجلس کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہوتا تھا۔
- حضورؐ جب کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں تک مجلس پہنچ چکی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے اور اس بات کی تلقین بھی فرماتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضورؐ جس جگہ بیٹھ جاتے وہی جگہ مجلس کا صدر مقام بن جاتی تھی۔
- ہر صاحبِ مجلس کو حضورؐ اس کا حصہ دیتے تھے اور کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے دوسرے اصحابِ مجلس سے کم توجہ مل رہی ہے۔
- حضورؐ کے سامنے کوئی شخص اپنا مسئلہ پیش کرتا یا کسی مسئلے پر بات کرتا تو آپؐ اس کی پوری بات سنتے تھے اور جب تک وہ اپنی بات مکمل نہ کرلیتا اس سے رخ نہیں پھیرتے تھے۔
- کوئی شخص حضورؐ کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرتا تو آپ اس کی ضرورت پوری کرتے، یا نرمی کے ساتھ تسلی کی کوئی بات فرما دیتے۔
- آنحضرتؐ کی مجلس علم کی مجلس ہوتی تھی، حیا کی مجلس ہوتی تھی، کسی پر الزام تراشی نہیں ہوتی تھی،

کسی پر تہمت نہیں لگائی جاتی تھی، کسی کی غلطی کو اچھالا نہیں جاتا تھا، اور آپؐ اپنے ساتھیوں کے لیے باپ جیسے شفیق ہوتے تھے۔

معاشرتی طرز عمل

مجلس سے ہٹ کر جناب نبی اکرمؐ کا عمومی انداز اور طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ

- بے مقصد باتوں سے اپنی زبان کو بچاتے تھے اور وہی بات فرماتے تھے جس کی ضرورت ہوتی تھی۔
- لوگوں کو قریب کرنے کی بات کرتے تھے، دور کرنے والی باتوں سے گریز کرتے تھے۔
- کسی قوم کا بڑا آپ کے پاس آتا تو اس کا اکرام کرتے تھے اور اس کے ساتھ اسی سطح کا معاملہ فرماتے تھے۔
- لوگوں کو اللہ کا خوف دلاتے رہتے تھے۔
- لوگوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے مگر کسی کو بے رخی کا احساس بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔
- اپنے ساتھیوں کے حالات معلوم کرتے تھے اور اگر کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس کی تحسین فرماتے اور اسے تقویت دیتے۔
- آپؐ اگر کوئی قبیح معاملہ دیکھتے تو اس کی قباحت کا ذکر کرتے اور حوصلہ شکنی کرتے تھے۔
- حضورؐ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ لوگ خیر کے معاملات سے غافل نہ ہوجائیں اور اس بات کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ وہ اکتا نہ جائیں۔
- ہر قسم کے معاملے کا آپ کے پاس حل تیار ہوتا تھا اور ہر صورتحال کے لیے مستعد ہوتے تھے۔
- آپؐ حق بات کہنے سے نہیں کتراتے تھے اور ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔
- لوگوں میں سے آپؐ سے زیادہ قریب وہی حضرات ہوتے تھے جو اچھے لوگ ہوتے تھے۔
- جناب نبی اکرمؐ کے ہاں سب سے زیادہ قابلِ احترام وہی شخص ہوتا تھا جو لوگوں کے ساتھ

نصیحت اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو۔ اور آپؐ کے ہاں اس شخص کو زیادہ قدر حاصل ہوتی تھی جو عام لوگوں کے ساتھ غم خواری اور مدد میں پیش پیش ہوتا تھا۔

متوازن زندگی

آنحضرتؐ کے روز مرّہ معمولات اور طرز عمل کے بارے میں یہ ارشادات حضرت علیؓ کے ہیں۔ جبکہ بخاری شریف کی ایک راویت کے مطابق ایک بار چند نوجوان صحابہ کرامؓ نے باہمی مشورہ کر کے حضورؐ کے گھر کے اندر کے معمولات معلوم کرنا چاہے تاکہ وہ بھی ان معمولات کی پیروی کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے امہات المومنینؓ کی خدمت میں باری باری حاضری دی اور دریافت کیا کہ آنحضرتؐ جب گھر کے اندر تشریف لاتے ہیں تو آپؐ کے معمولات کیا ہوتے ہیں؟ ازواج مطہراتؓ میں سے ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ گھر کے اندر آپؐ کے معمولات کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو ہر گھر کے سربراہ کے ہوتے ہیں۔ آپؐ آرام فرماتے ہیں، بیوی بچوں کو وقت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، آنے جانے والوں کے حالات دریافت کرتے ہیں، گھر کا کوئی کام کاج ہو تو اس میں ازواج مطہراتؓ کا ہاتھ بٹاتے ہیں، حتیٰ کہ جوتا گانٹھ لیتے ہیں، چارپائی کی مرمت کر لیتے ہیں اور اس طرح کے ضرورت کے کام آپؐ خود کر لیا کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی خارجہ پالیسی

(۱۱فروری ۲۰۱۲ء کو جناح باغ لاہور کی دارالسلام لائبریری کے زیر اہتمام ”نبی اکرمؐ کی خارجہ پالیسی“ کے عنوان سے منعقدہ سیمینار سے خطاب۔ مطبوعہ روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۵فروری ۲۰۱۲ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ”خارجہ پالیسی“ کا جملہ جب بولا جاتا ہے تو سب سے پہلا یہ تاثر سامنے آتا ہے کہ ایک ریاست اور حکومت کو دوسری ریاستوں، حکومتوں اور قوموں کے ساتھ اپنے معاملات چلانے اور دنیا میں ان کے ساتھ مل جل کر رہنے کے لیے کوئی طریق کار اور اصول و قوانین طے کرنے ہیں۔

اس مفہوم میں جب ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی کے لیے ان کے طے کردہ اصولوں اور ہدایات کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو گفتگو کا دائرہ یہ بنتا ہے کہ مدینہ منورہ کی ریاست وجود میں آنے اور اس میں آنحضرتؐ کی حکومت و اقتدار قائم ہونے کے بعد خارجہ پالیسی کے بارے میں آپؐ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور کیا ہدایات دی تھیں؟

خطوط، معاہدات اور مکالمات

اس کے لیے ہمیں بنیادی طور پر

۱۔ حضورؐ کے ان خطوط کا مطالعہ کرنا ہوگا جو آپؐ نے دنیا کے مختلف ممالک کے حکمرانوں کو ارسال فرمائے تھے،

۲۔ ان معاہدات کا جائزہ لینا ہوگا جو متعدد اقوام اور ریاستوں کے ساتھ آپؐ نے کیے تھے،

۳۔ اور ان وفود کے ساتھ رسالت مآبؐ کی گفتگو اور رویے کو سامنے رکھنا ہوگا جو مختلف مواقع پر مختلف اقوام کی طرف سے مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے حضورؐ کے ساتھ باہمی معاملات پر گفتگو کی۔

دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کے بارے میں قرآن کریم نے بیسیوں آیات میں احکام دیے

ہیں اور ظاہر بات ہے کہ آنحضرتؐ کی خارجہ پالیسی کی بنیاد انہی آیاتِ قرآنیہ پر تھی۔ ان ساری باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو صورتحال سامنے آتی ہے اس کے پیشِ نظر میری طالب علمانہ رائے میں حضورؐ کی خارجہ پالیسی کے بعض حصوں کو درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

خارجہ پالیسی کے اہم نکات

عالمگیریت کا آغاز

جناب نبی اکرمؐ رسولِ انسانیت ہیں اور آپؐ کی دعوت و نبوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے۔ آپؐ نے مکہ مکرمہ میں نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطاب کیا تھا وہ یا ایھا الناس کے عنوان سے تھا کہ قریشیوں یا عربوں سے خطاب کرنے کی بجائے نبی آخر الزمانؐ پوری نسلِ انسانیت سے مخاطب ہوئے تھے۔ آج گلوبلائزیشن کے حوالے سے مغربی دنیا کچھ بھی کہے، مگر تاریخی حقیقت یہ ہے کہ رنگ و نسل، قومیت، جغرافیہ، اور زبان وغیرہ کی حدود سے بالاتر ہو کر پوری نسل انسانیت کو اپنی دعوت و خطاب کا عنوان سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا تھا اور گلوبلائزیشن کے اولین بانی پوری تاریخ انسانی میں حضورؐ ہی تھے۔ اس لیے آپؐ نے دوسری قوموں، حکومتوں، اور سرداروں کو جو خطوط لکھے ان میں سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت اسلام کے تعارف اور دعوت کو حاصل تھی جو جناب رسول اللہؐ کی عالمگیر نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا۔

دینِ فطرت کی دعوت اور حائل رکاوٹوں کا سدباب

جناب نبی اکرمؐ چونکہ دینِ فطرت لے کر آئے تھے جس کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر ہے اور آپؐ کا دین تمام آسمانی دینوں کا آخری اور فائنل ورژن ہے، چنانچہ پوری نسلِ انسانی کو فطری اور وحی کی طرف لانا بھی آنحضرتؐ کے مقاصدِ نبوت میں سے تھا جس کے لیے اسلام کا غلبہ اور برتری نسلِ انسانی کی ناگزیر ضرورت تھا۔ اس لیے آپؐ نے دنیا کے تمام انسانوں کو دعوت دی کہ وہ اسلام قبول کریں۔ اور اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو نسلِ انسانی تک اس دین کے پہنچنے اور انسانوں کے اس مذہب کو قبول کرنے میں مزاحمت نہ کریں اور رکاوٹ نہ بنیں، یعنی وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی اسلام کے فروغ اور غلبے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔

یہ بات میرے خیال میں ایسی ہی ہے جیسے آج مغرب دنیا کے تمام ممالک واقوام سے کہہ رہا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک مغربی تہذیب و ثقافت سب سے بہتر اور ایک آئیڈیل فلسفہ و تہذیب کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے دنیا کے تمام اقوام و ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ویسٹرن سولائزیشن کی بالادستی کو قبول کریں اور اپنی اپنی علاقائی تہذیبوں اور ثقافتوں کو مغربی تہذیب و ثقافت کی حدود میں لے آئیں۔ مغرب اس کے لیے قوت، لابنگ، اور دھونس کے سارے حربے استعمال کر رہا ہے اور دنیا بھر میں اپنی ثقافت کی بالادستی قائم کرنے کی جنگ لڑ رہا ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اسلام کا موقف بھی کم و بیش یہی ہے کہ چونکہ وہ دینِ فطرت ہے اس لیے اس کی بالادستی کے سامنے دنیا کی تمام اقوام و ممالک کو سرِتسلیم خم کر دینا چاہیے۔

چنانچہ اصل جھگڑا یہ نہیں ہے کہ کسی تہذیب و ثقافت کی بالادستی تسلیم کرانے کے لیے طاقت کا استعمال درست ہے یا نہیں، بلکہ اصل تنازع یہ ہے کہ مغرب کے دعوے کے مطابق دنیا پر بالادستی کا حق ویسٹرن سولائزیشن کو ہے، جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ نسل انسانی کی قیادت کا حق دین فطرت کو حاصل ہے اور انسانیت کی بھلائی اسی دین و ثقافت کو قبول کرنے میں ہے۔

بہرحال جناب نبی اکرمؐ کی خارجہ پالیسی کا دوسرا بڑا نکتہ اسلام کا غلبہ اور اس کی بالادستی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنا تھا۔ اسی وجہ سے حضورؐ یہ ہدایت دیا کرتے تھے کہ پہلے دوسری قوموں کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر اسے قبول نہ کریں تو اس بات کی دعوت دو کہ وہ اسلام کی بالادستی اور برتری تسلیم کریں اور اس کے فروغ و نفاذ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اور اگر وہ اسلام بھی قبول نہ کریں اور اس کی اشاعت میں رکاوٹ بھی بنیں تو ان سے جہاد کرو۔ گویا جہاد اور جنگ اسلام قبول نہ کرنے پر نہیں ہے، بلکہ اس کی راہ میں مزاحم ہونے پر ہے۔

اسلام قبول نہ کرنے والی اقوام کے ساتھ معاملات

اسلام قبول نہ کرنے والی اقوام کے ساتھ معاملات میں قرآن کریم نے جو ہدایات دی ہیں ان کی روشنی میں ان اقوام و ممالک کی درجہ بندی تین دائروں میں کی جاسکتی ہے، اس طرح یہ تین اصول ہیں جنہیں اسلام کی خارجہ پالیسی کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے:

۱۔ سورۃ الممتحنۃ کی آیت ۸ کے مطابق جو قومیں مسلمانوں کے ساتھ دین کے حوالے سے جنگ

نہیں کرتیں اور مسلمانوں کو ان کے ملک اور زمین سے محروم کرنے کے عمل میں شریک نہیں ہیں، ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور برابری کی بنیاد پر تعلقات کی اجازت ہے۔ انہیں فقہائے کرام کی اصطلاح میں غیر محارب اقوام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس سے اگلی آیتِ کریمہ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ دین کے حوالے سے مسلمانوں سے جھگڑا کرتے ہیں، مسلمانوں کو ان کی زمین اور وطن سے محروم کرنے کے لیے سرگرمِ عمل رہتے ہیں، اور ایسا کرنے والوں کے ساتھ اس معاملہ میں معاون ہوتے ہیں، ان قوموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی اجازت نہیں ہے۔

۳۔ جبکہ سورہ آل عمران کی آیت ۲۸ میں حکمِ الٰہی یہ ہے کہ مسلمان کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو مسلمان کافروں کو دوست بنائیں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کسی بات پر نہیں ہیں۔ البتہ کافروں کے شر سے بچنے کے لیے ظاہری تعلقات رکھے جا سکتے ہیں۔ اسے ’’تحفظاتی دائرے‘‘ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سازشی گروہوں کے حوالے سے حکمتِ عملی

جناب نبی اکرمؐ کی خارجہ پالیسی میں یہ بات ایک بڑی حکمتِ عملی سمجھی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں جب آپؐ نے ’’میثاقِ مدینہ‘‘ کی صورت میں یہودیوں کے ساتھ ایک مشترکہ ریاست تشکیل دی تھی، جس پر یہودی قائم نہ رہے اور معاہدہ شکنی کی پاداش میں یکے بعد دیگرے یہودیوں کے تینوں قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر، اور بنو قریضہ مدینہ منورہ سے جلاوطن ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے خیبر کو مرکز بنا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو یہودیوں کے ساتھ یہ فیصلہ کن جنگ نظر آنے لگی۔ اس پر جناب رسول اللہؐ نے خیبر کی جنگ سے پہلے قریشِ مکہ کے ساتھ ’’معاہدۂ حدیبیہ‘‘ کر کے اس محاذ کو خاموش کیا اور اس کے فوراً بعد خیبر پر حملہ کر کے یہودیوں سے نمٹ لینے کا اہتمام کیا جو کہ جنگی اور سفارتی فراست و تدبر کا شاہکار ہے۔

بین الاقوامی چیلنجز کا سامنا

جناب نبی اکرمؐ نے بین الاقوامی سطح پر برابری اور رواداری کے باوجود اگر کہیں سے کوئی چیلنج سامنے آیا تو اسے قبول کرنے میں کمزوری نہیں دکھائی اور چیلنج کو قبول کر کے اس کا بروقت سامنا کیا۔ جیسا کہ

حضورؐ کے ایک سفیر کو شام کے علاقے میں قتل کیا گیا تو آپؐ نے اس دور کے عالمی عرف کے مطابق اسے اعلانِ جنگ تصور کرتے ہوئے حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں لشکر شام کی طرف روانہ کیا جس نے موتہ کے مقام پر جنگ لڑی اور اس میں حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ شہید ہوئے۔

ابلاغ کی جنگ

غزوۂ خندق کے بعد جناب رسول اللہؐ نے اعلان فرمایا کہ قریشِ مکہ ہمارے خلاف آخری زور لگا چکے ہیں، اب وہ ہمارے خلاف جنگ کے لیے میدان میں نہیں آئیں گے بلکہ اب ہم ان کی طرف جنگ کرنے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب قریش اور ان کے ہمنوا تلوار کی جنگ نہیں لڑیں گے بلکہ شعر و شاعری اور ادب و خطابت کے ذریعے اسلام کی توہین اور مسلمانوں کی کردارکشی کی جنگ لڑیں گے۔ اسے میں آج کے عرف کے مطابق ''میڈیا وار'' سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ جناب نبی اکرمؐ نے یہ جنگ لڑنے کے لیے صحابہ کرامؓ کو دعوت دی تو تین بڑے شاعر حسان بن ثابتؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، اور کعب بن مالکؓ سامنے آئے اور ان کے ساتھ ایک بڑے خطیب ثابت بن قیسؓ بھی میدان میں ڈٹ گئے اور ان چاروں نے شاعری اور خطابت کے میدان میں کفر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

عسکری طاقت کا حصول

اس کے ساتھ ہی عسکری قوت میں بھی قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس حد تک آگے بڑھنے کا حکم دیا کہ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے اس قدر طاقتور ہونا چاہیے کہ دشمن اس سے خوفزدہ ہوں اور طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے کہ ایک مؤثر خارجہ پالیسی کے لیے جہاں داخلی استحکام اور قومی وحدت ضروری ہے وہاں عسکری قوت میں بالادستی اور رعب بھی اس کا ناگزیر تقاضا ہے، اور قرآن کریم نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔

یہ چند نکات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ پالیسی کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں آئے جو عرض کر دیے ہیں۔ جبکہ اجتماعیت اور نظام کے حوالے سے جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات اور پالیسیوں کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کرنے اور انہیں آج کی زبان و اسلوب میں سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ ہم مسلمان بالخصوص دینی حلقے اس اہم دینی و ملی ضرورت کی طرف توجہ دے

سکیں، آمین یارب العالمین۔

امتِ مسلمہ کی صورتحال اور اسوۂ نبوی ﷺ

(۲۳ جنوری ۲۰۱۳ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں ایک مذاکرہ سے گفتگو جس کا عنوان تھا ''امتِ مسلمہ کی موجودہ صورتحال اور اسوۂ نبویؐ''۔ مطبوعہ روزنامہ اسلام لاہور، ۲۵ جنوری ۲۰۱۳ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ قیامت تک ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور ہر دور میں نسلِ انسانی اس سے راہنمائی حاصل کرتی ہے۔ آج بھی نسلِ انسانی اور خاص طور پر امتِ مسلمہ کے لیے یہی راہنمائی فلاح و نجات کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

امتِ مسلمہ اس وقت جن مسائل میں الجھی ہوتی ہے ان کی فہرست بہت طویل ہے اور انہیں صرف شمار کیا جائے تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہے، لیکن ان میں سے چند بڑے بڑے مسائل کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں تاکہ یہ بات ہمارے ذہنوں میں تازہ ہو جائے کہ ہمیں اسوۂ نبویؐ سے کیسے راہنمائی حاصل کرنی ہے۔

جاہلی اقدار کی واپسی

جناب رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں بہت سی باتیں نسل انسانی اور امت کی راہنمائی کے لیے فرمائی تھیں، ان میں سے دو باتوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کل امر الجاهلية موضوع تحت قدمی ''کہ جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں، یعنی نسلِ انسانی کو جاہلیت کے دور سے نکال کر علم اور روشنی کی طرف لے جارہا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ایک جاہلی قدر یعنی باہمی قتل و قتال کا ذکر کر کے فرمایا کہ لا ترجعوا بعدی ضلالا میرے بعد پھر گمراہی کے دور کی طرف واپس نہ چلے جانا۔

ہمیں آج اس امر کا جائزہ لینا ہو گا کہ جن جاہلی اقدار کو آنحضرتؐ نے پاؤں تلے روند کر علم اور روشنی پر مبنی سوسائٹی قائم کی تھی وہ جاہلی اقدار کہیں پھر تو ہمارے معاشرے میں واپس نہیں آگئیں؟ آج ہمارا

حال یہ ہے کہ حضورؐ کا تذکرہ محبت اور عقیدت کے ساتھ تو کرتے ہیں اور ان کے مبارک تذکرے سے ثواب اور برکات بھی حاصل کرتے ہیں لیکن راہنمائی کے لیے اوروں کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عقیدت و محبت اور ثواب و برکات کے ساتھ ساتھ راہنمائی کے لیے بھی جناب رسول اللہؐ کی طرف رجوع کریں اور ان جاہلی اقدار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں جو آج پھر سے ہماری سوسائٹی میں عام ہوگئی ہیں، اور اس معاشرہ کے احیا کے لیے محنت کریں جو آپؐ نے تیئیس سال کی محنت سے قائم کر کے دنیا کے سامنے بطور مثال پیش کیا تھا۔

قانون کی عملداری میں امتیاز

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اس لیے تباہی کا شکار ہوئیں کہ ان کے ہاں قانون کا نفاذ سب پر یکساں نہیں ہوتا تھا، غریب آدمی جرم کرتا تو اسے سزا دی جاتی تھی لیکن معاشرہ کے بڑے لوگ اور وی آئی پی جرم کا ارتکاب کرتے تو وہ سزا سے بچ جاتے تھے۔ آپؐ نے اس صورتحال کو امتوں کی تباہی کا باعث قرار دیا ہے۔ جبکہ ہمارا عمومی مزاج یہ بن گیا ہے کہ کوئی بڑا آدمی سنگین سے سنگین جرم بھی کرتا ہے تو اس کے لیے باقاعدہ گنجائشیں تلاش کی جاتی ہیں اور اسے سزا سے بچانے کے لیے پورا نظام متحرک ہوجاتا ہے۔

خیانت اور نااہلی کا دور دورہ

جناب نبی اکرمؐ نے دیانت و امانت کو مسلمان فرد اور امت کا فریضہ قرار دیتے ہوئے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ امانت اور دیانت جب دنیا سے ختم ہوجائے گی تو یہ قیامت کا پیش خیمہ ہوگا۔ بددیانتی اور نااہلی کی ایک صورت جناب رسول اللہؐ نے یہ بھی بیان فرمائی کہ جب معاملات اور اختیارات نااہل لوگوں کے سپرد ہونے لگیں گے تو سمجھ لینا کہ قیامت قریب ہے۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سب کرپشن، نااہلی اور بددیانتی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اسے فخر کی بات سمجھا جاتا ہے۔ عالمِ اسلام میں عمومی طور پر ہمارا حال یہ ہے کہ کرپشن اور بددیانتی کا دور دورہ ہے اور لوٹ کھسوٹ اور اختیارات کے غلط استعمال کے علاوہ تجارت اور کاروبار میں بھی ہماری ساکھ بری طرح مجروح ہوچکی ہے۔ تجارتی دنیا میں ہماری ساکھ سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے اور بین الاقوامی برادری

میں ہمارا اعتماد کسی طرح بحال نہیں ہو رہا۔

سائنس و ٹیکنالوجی میں پسماندگی

جناب نبی اکرمؐ نے امت کو دشمن کے مقابلہ میں ہر وقت تیار رہنے کا حکم دیا تھا اور جنگی قوت اس حد تک فراہم کرنے کا حکم دیا تھا کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب رہے، یعنی دنیا میں جنگی طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے لیکن آج ہم سائنس، ٹیکنالوجی اور جنگی اسباب میں باقی دنیا سے بہت پیچھے ہیں۔

اس لیے آج ہم سے اسوۂ نبویؐ کا یہ تقاضہ ہے کہ

- ہم راہنمائی کے اصل سرچشمہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کر کے دوسروں کی ذہنی غلامی سے نجات حاصل کریں،
- کرپشن اور نااہلی کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کریں،
- قانون کی سب کے لیے یکساں عملداری کا اہتمام کریں،
- سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے آگے بڑھنے کو اپنا ہدف قرار دیں،
- اور جاہلیت کی ساری قدروں کو پھر سے پاؤں تلے روندتے ہوئے صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین کے دور کی مسلم سوسائٹی کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے محنت کریں۔

سرکاری حیثیت و منصب کا ناجائز استعمال

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکاری عمّال کے احتساب کی روایت قائم کی تھی۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب رسالتمآبؐ کے ایک نمائندہ خیبر میں زکوٰۃ و عشر وغیرہ کی وصولی کے لیے گئے تو واپسی پر انہوں نے محصولات کا حساب پیش کیا اور اس موقع پر ایک گٹھڑی الگ رکھ لی کہ یہ لوگوں نے مجھے ذاتی طور پر ہدیے دیے تھے۔ آپؐ اس پر سخت لہجے میں تنبیہ فرمائی کہ اگر تم اپنی ماں کے گھر میں بیٹھے ہوتے تو کیا یہ لوگ تمہیں وہاں بھی ہدیے پہنچاتے؟ یہ فرمایا کر وہ سامان بیت المال میں جمع کرا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے یہ سبق دیا کہ کسی سرکاری افسر کو جو مفادات اس کے عہدہ کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ اس کا حق نہیں بلکہ سرکاری خزانے میں جمع ہونے چاہئیں،

مگر آج ہمارا حال یہ ہے کہ سرکاری حیثیت سے اور منصب سے ناجائز مفادات حاصل کرنا ہمارا مزاج بن گیا ہے، جو افسر ایسا نہیں کرتا اسے بے وقوف سمجھا جاتا ہے اور یہی مزاج ہمارے معاشرہ میں کرپشن کے استحکام کا باعث بنا ہوا ہے۔

سودی لین دین کا رواج

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کا خاتمہ کیا تھا اور معمولی سے لین دین میں بھی سود کو روا نہیں رکھا تھا۔ حضرت بلالؓ جناب نبی اکرمؐ کے لیے عمدہ کھجوریں لائے اور فرمایا کہ آپ کو اچھی کھجوریں کھلانے کے لیے میں نے عام کھجوریں زیادہ دے کر ان کے عوض عمدہ کھجوریں تھوڑی مقدار میں خریدی ہیں۔ حضورؐ نے اسے عین ربوا (سود) قرار دیتے ہوئے اس قسم کے سودے سے منع فرمادیا اور حکم دیا کہ اگر ایک ہی جنس کی گھٹیا قسم کا تبادلہ عمدہ قسم سے کرنا ہو تو ردی قسم پیسوں کے عوض فروخت کر کے پیسوں کے عوض اچھی کھجوریں لے لو تاکہ سود سے بچ جاؤ۔ مگر ہمارے ہاں سود ہمارے کاروبار اور معیشت کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

اسلامی رفاہی ریاست کی عدم موجودگی

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رعیت کے بارے میں ریاست کی معاشی ذمہ داریوں کو بیان فرمایا تھا اور ان کی تکمیل کے لیے بیت المال کا نظام قائم کیا تھا جسے خلفاء راشدین نے ایک پورے نظام کی شکل دی اور دنیا کو رفاہی ریاست یعنی ویلفیئر اسٹیٹ کا عملی نمونہ دکھایا۔ حتیٰ کہ آج ویلفیئر اسٹیٹ کے اسی تصور اور نظام سے مغرب کے بہت سے ممالک نے رفاہی ریاست کا سسٹم قائم کیا ہے اور بعض ممالک تو ویلفیئر سوشل سسٹم اور قوانین کو حضرت عمرؓ کے نام سے باضابطہ موسوم کرتے ہیں، لیکن ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ دوسری اقوام اور ممالک تو خلافتِ راشدہ کے ویلفیئر سسٹم سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں مگر مسلمان ممالک میں اس وقت کوئی بھی ایسا ملک موجود نہیں ہے جسے خلافتِ راشدہ کی طرز پر رفاہی ریاست قرار دیا جا سکے۔

یہ سیرتِ طیبہ کے چند پہلو ہیں جن سے آج کے دور میں سب سے زیادہ راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

عدلِ اجتماعی کا تصور
تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

(۲۹ جنوری ۲۰۱۳ء کو ڈسٹرکٹ کونسل ہال گوجرانوالہ میں محکمہ اوقاف و مذہبی امور کی طرف سے منعقدہ ڈویژنل سیرت کانفرنس سے خطاب۔ مطبوعہ روزنامہ اسلام لاہور، ۳۱ جنوری ۲۰۱۳ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج مجھے عدلِ اجتماعی کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور ارشادات گرامی کے حوالہ سے کچھ عرض کرنا ہے، اور اس کے بیسیوں پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو پر چند معروضات پیش کروں گا۔ وہ یہ کہ عام طور پر ایک حکومت اور ریاست کی ذمہ داری میں شہریوں کی جان و مال کی حفاظت، امن کی فراہمی، انصاف کے قیام اور ان کے حقوق کی پاسداری کو شامل کیا جاتا ہے لیکن جناب رسول اللہؐ نے حکومت و ریاست کی ذمہ داریوں میں ایک اور بات کا اضافہ کیا کہ وہ شہریوں کو ضروریات زندگی کی فراہمی اور سوسائٹی کے نادار، بے سہارا اور معذور لوگوں کی کفالت کی بھی ذمہ دار ہے۔ اسی کو آج کی دنیا میں رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رفاہی ریاست کا آغاز

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ مال اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا ومن ترک کلًا وضیاعًا فالیّ وعلیّ اور جو شخص قرض کا بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کریں گے اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ گویا آپؐ نے فرمایا کہ سوسائٹی کے نادار، مستحق اور بے سہارا اپنی ضروریات کے لیے میرے پاس آئیں گے، اور آپؐ نے بات صرف فالیّ پر نہیں چھوڑی بلکہ وعلیّ فرما کر خود کو اس کا ذمہ دار بھی قرار دیا۔

چنانچہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بیت المال کا تصور سامنے آیا جس کا دائرہ آنحضرتؐ کے دور میں یہ تھا کہ کسی شخص کو جو ضرورت بھی پیش آتی تھی وہ آپؐ سے رجوع کرتا تھا اور آپؐ بیت المال کے فنڈ سے اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ بیسیوں واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن میں سے صرف دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کو ایک سفر کے لیے کچھ اونٹ درکار تھے، میں خاندان کا نمائندہ بن کر جناب رسول اللہؐ کے پاس گیا اور سواریوں کا تقاضہ کیا، اس وقت آنحضرتؐ کے پاس اونٹ موجود نہیں تھے اس لیے آپؐ نے نہیں دیے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے اونٹوں کا بندوبست ہو گیا تو مجھے واپس بلا کر دو جوڑے میرے حوالے کیے۔

اسی طرح ایک واقعہ حضورؐ کی خوش طبعی اور دل لگی کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ مجھے سفر کے لیے اونٹ کی ضرورت ہے۔ آپؐ نے فرمایا ٹھہرو میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں، وہ شخص فکرمند ہو گیا کہ میں اونٹنی کے بچے کے ساتھ کیا کروں گا، تھوڑی دیر اس کی فکرمندی سے محظوظ ہونے کے بعد حضورؐ نے فرمایا، خدا کے بندے! جو اونٹ میں تجھے دوں گا وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہو گا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی ضروریات کے لیے نبی اکرمؐ سے رجوع کرتے تھے اور بیت المال سے ان کی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔ جبکہ اسے آپؐ نے حکمرانوں کی مہربانی اور احسان قرار دینے کی بجائے حکومت کی ذمہ داریوں کے طور پر بیان کیا ہے۔

خود آنحضرتؐ کا مالی نظام یہ تھا کہ غنیمت میں سے بیت المال کو خمس یعنی پانچواں حصہ ملتا تھا اور اس خمس کا خمس، جو کل غنیمت کا چارفی صد بنتا ہے، حضورؐ کو اپنے ذاتی اور گھریلو اخراجات کے لیے دیا جاتا تھا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس خمس الخمس میں سے حضورؐ اپنی ازواج اور خاندان کے دیگر افراد کو خرچہ دیتے تھے اور یہ خرچے پورے ہونے کے بعد جو بچ جاتا تھا وہ پھر بیت المال کو عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے واپس کر دیتے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کو لوگوں کی ضروریات حسبِ موقع فراہم کرنے کا ذمہ دار قرار دینے کی بات سب سے پہلے جناب نبی اکرمؐ نے کی ہے اور وہیں سے رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کا آغاز

ہوتا ہے، اور آج بہت سی حکومتوں نے رفاہی ریاست کا یہ نظام اختیار کر رکھا ہے۔

اسلامی ریاست کا سالانہ بجٹ

یہ نظام خلفاء راشدینؓ کے دور میں باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ایک عملی صورت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دورِ خلافت کے ایک واقعہ کا ذکر کر کے واضح کرنا چاہتا ہوں، جبکہ اس وقت مدینہ منورہ میں جناب رسول اللہؐ کی طرف سے بیت المال کے آغاز کو کم و بیش ایک صدی گزر چکی تھی۔

"کتاب الاموال" میں امام ابو عبید قاسم بن سلّامؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دورِ خلافت میں ان کے عراق کے گورنر عبد الحمیدؒ نے ایک سال انہیں خط لکھا کہ صوبہ میں زکوٰۃ و عشر اور دیگر محصولات کی وصولی کے بعد پورے سال کا خرچہ اور بجٹ پورا کر کے کچھ رقم بچ گئی ہے، اس کے بارے میں بتایا جائے کہ ہم کیا کریں؟

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب لکھا کہ یہ سروے کرواؤ کہ تمہارے صوبے میں جو لوگ مقروض ہیں اور اپنا قرضہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے قرضے اس رقم میں سے ادا کر دو،

گورنر نے جواب دیا کہ حضرت! یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔

امیر المؤمنین نے دوسرا خط لکھا کہ جن بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہیں ان کی شادیاں اس رقم میں سے کرا دو۔

گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں۔

امیر المؤمنین نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے ابھی تک بیویوں کے مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے مہر اس رقم میں سے دلوا دو۔

گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں۔

امیر المؤمنین نے چوتھا خط لکھا کہ زمینوں کا سروے کرواؤ اور بے آباد زمینوں کی کاشت کے لیے کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ میں نے یہ واقعہ ایک مجلس میں بیان کیا تو ایک نوجوان نے مجھ سے سوال

کیا کہ مولوی صاحب! یہ صوبے کا بجٹ تھا یا بحر الکاہل تھا، ایک صوبے کے بجٹ میں اتنے پیسے کدھر سے آ گئے تھے؟ میں نے جواب دیا کہ انہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک اور واقعہ سن لو یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی۔

"کتاب الاموال" ہی کی روایت کے مطابق ایک دن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ شام کے وقت گھر واپس آئے تو اہلیہ سے پوچھا کہ تمہارے پاس ایک درہم ہو تو مجھے دے دو ضرورت ہے۔ اس نے پوچھا کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ گھر آتے ہوئے راستے میں ایک ریڑھی پر انگور دیکھے ہیں، انگور کھانے کو جی چاہتا ہے مگر جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اہلیہ نے کہا کہ آپ کے پاس نہیں ہیں تو میرے پاس کہاں سے آئیں گے؟ پھر اس نے بیویوں والے انداز میں کہا کہ آپ کیسے امیر المؤمنین ہیں کہ اپنے لیے ایک درہم کے انگور بازار سے نہیں منگوا سکتے؟

میں اس کا ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ کیا آپ کے پاس اتنا صوابدیدی فنڈ بھی نہیں ہے کہ ایک درہم کے انگور اپنے لیے خرید سکیں؟ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس پر فرمایا کہ خدا کی بندی جس درہم کی تم بات کر رہی ہو وہ درہم نہیں آگ کا انگارہ ہے۔

میں نے اس نوجوان سے کہا کہ برخوردار! جس ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے درہم کو آگ کا انگارہ سمجھے گا اس کے بجٹ میں پیسے ہی پیسے ہوں گا، پھر مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہوں گے، کنواروں کی شادیاں بھی ہوں گی، خاوندوں کے مہر بھی ادا ہوں گے، اور کسانوں کو قرضے بھی ملیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے روپے کو آگ کا انگارہ تصور کرے۔

حضرات محترم! میں نے عدلِ اجتماعی اور سوشل جسٹس کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی صرف ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کی ہے، آج کی دنیا کو اسی نظام کی تلاش ہے اور یہی نسلِ انسانی کی بہت بڑی ضرورت ہے، یہ ہماری ضرورت بھی ہے اور ذمہ داری بھی کہ دنیا کو سوشل جسٹس کے اس تصور سے متعارف کرائیں اور جناب رسول اللہؐ اور خلفاء راشدینؓ کی تعلیمات کی روشنی میں صحیح سمت نسلِ انسانی کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔

میڈیا کا محاذ اور اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ فروری ۲۰۱۳ء)

۲۳ جنوری ۲۰۱۳ء کو پریس کلب لاہور میں ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا جس میں جناب امجد اسلام امجد، جسٹس (ر) نذیر غازی، جناب اوریا مقبول جان اور دیگر ممتاز دانشور بھی شریک تھے۔ سیمینار میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس و حرمت کے حوالے سے بنائی جانے والی ایک فلم زیرِ بحث تھی اور اس فلم کا ایک حصہ شرکاء کو دکھایا گیا، میں نے اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اس فلم کے حوالہ سے دو پہلوؤں پر تو کچھ عرض نہیں کر سکوں گا:

۱۔ ایک اس کا فنی اور تکنیکی پہلو ہے جس کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، اس لیے کہ میں اس فن سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی اس کا ذوق رکھتا ہوں۔

۲۔ دوسرا پہلو جواز اور عدمِ جواز کی بحث کا ہے، اس کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں کہہ سکوں گا، اس لیے کہ یہ مفتیان کرام کا کام ہے اور میں مفتی نہیں ہوں۔

چنانچہ نہ تو اس سلسلہ میں کوئی فتویٰ دوں گا اور نہ ہی کسی فتوے سے اختلاف کرنا چاہوں گا۔ البتہ ایک اور پہلو سے کچھ معروضات پیش کروں گا اور وہ ہے ضرورت کا پہلو۔ چونکہ میں خود بھی اس محاذ کا آدمی ہوں، اس لیے محاذ کی ضروریات اور تقاضوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔

قریشِ مکہ کے خلاف ابلاغ کی جنگ

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگِ احزاب سے فارغ ہوئے تو آپ نے مسجد نبویؐ میں ایک اعلان فرمایا کہ

۱۔ اب قریشیوں کو ہمارے خلاف جنگ کے لیے یہاں آنے کی ہمت نہیں ہوگی، اب جب بھی جائیں گے ہم ہی جائیں گے۔

۲۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ اب یہ ہمارے خلاف زبان کی جنگ لڑیں گے اور خطابت و شاعری کا محاذ گرم کریں گے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کا بازار گرم کریں گے، پروپیگنڈہ کریں گے، کردار کشی کریں گے اور عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائیں گے۔ یہ فرما کر جناب رسول اللہؐ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ اس جنگ میں کون آگے بڑھے گا؟

اس موقع پر تین انصاری صحابیؓ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ جنگ ہم لڑیں گے۔ چنانچہ ان تینوں نے شاعری کے محاذ پر جبکہ ایک اور انصاری صحابی حضرت ثابت بن قیسؓ نے خطابت کے محاذ پر یہ جنگ لڑی اور اس شان سے لڑی کہ حضرت حسان بن ثابتؓ مسجد نبویؐ میں منبر پر کھڑے ہو کر کفار کے ادبی حملوں کا جواب دیا کرتے تھے اور حضورؐ کی مدحت کے ساتھ ساتھ اسلام کی خوبیاں بیان کرتے تھے جبکہ آپؐ سامنے بیٹھے انہیں داد بھی دیتے تھے اور ان کے لیے دعا بھی فرماتے تھے۔

اسی طرح یہ واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے کہ عمرۃ القضا کے موقع پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ آنحضرتؐ کی اونٹنی کی مہار پکڑے جب مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے تھے تو احرام باندھے ہوئے تلبیہ پڑھنے کی بجائے رزمیہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں اس سے رک جانے کے لیے اشارہ کیا تو حضورؐ نے انہیں آواز دی کہ دعہ یا عمر عمرؓ! اسے پڑھنے دو، اس کے اشعار تمہارے تیروں سے زیادہ کافروں کے سینوں میں نشانے پر لگ رہے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ بنوتمیم کا وفد جب مدینہ منورہ آیا تو انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر و خطابت میں مقابلہ کی دعوت دے دی جو آپؐ نے قبول فرمائی۔ اس کے لیے باقاعدہ مجلس بپا ہوئی جس میں بنوتمیم کے شاعر و خطیب نے اپنی خطابت اور شاعری کے جوہر دکھائے جس کے جواب میں حضرت ثابت بن قیسؓ نے خطابت اور حضرت حسان بن ثابتؓ نے شاعری میں اسلام کی دعوت اور حضورؐ کی مدحت و تعارف پر بات کی، چنانچہ ان کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے بنوتمیم نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

ابلاغ کے محاذ پر آج کی ضروریات

اس لیے ایک بات تو میں یہ عرض کروں گا کہ شعر و خطابت اس دور میں ابلاغ کے مؤثر ترین ذرائع تھے جنہیں جناب رسول اللہؐ نے نظر انداز نہیں کیا بلکہ بھرپور طریقہ سے استعمال کیا۔ آج اس کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور ابلاغ کے دیگر مؤثر ترین ذرائع بھی سامنے آ گئے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ہمیں اسلام کی دعوت اور دفاع دونوں کے لیے ان کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔

دوسری بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ حالتِ امن اور حالتِ جنگ کے قوانین میں فرق ہوتا ہے، بہت سی باتیں جو حالتِ امن میں درست نہیں ہوتیں مگر حالت جنگ میں انہیں مجبورًا اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص محاذ جنگ پر دشمن کے سامنے کھڑا ہے تو اسے یہ دیکھنا ہے کہ دشمن کے ہاتھ میں کون سا ہتھیار ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں کون سا ہتھیار اختیار کر کے دشمن کو زیر کر سکتا ہے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

اس کی مثال عرض کروں گا کہ ایٹم بم کو اسلام کی جنگی اخلاقیات کی رو سے ایک جائز ہتھیار قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ جناب نبی اکرمؐ نے جنگ اور جہاد کے جو تقاضے اور دائرے بیان فرمائے ہیں کہ عورت کو قتل نہیں کرنا، بوڑھے کو قتل نہیں کرنا، غیر متعلقہ شخص کو قتل نہیں کرنا، بچے کو قتل نہیں کرنا اور دشمن کے اموال اور ملکیتوں کو بلا وجہ نقصان نہیں پہنچانا وغیرہ۔ ایٹم بم کے استعمال میں ان میں سے کسی بات کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے میری طالب علمانہ رائے میں اگر جنگ میں اسلامی اخلاقیات کا لحاظ رکھا جائے تو ایٹم بم ایک جائز ہتھیار نہیں ہے، لیکن ہم سب ایٹم بم کے بنانے پر زور دیتے ہیں اور ہم نے ایٹمی صلاحیت حاصل کی ہے۔ اس لیے کہ جب دشمن کے پاس یہ ہتھیار موجود ہے تو ہمارے پاس اس کا موجود ہونا ضروری ہے ورنہ ہم دشمن سے مار کھا جائیں گے۔ اسے اضطراری حالت کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حالتِ اضطرار میں جان بچانے کے لیے حرام کھانا جائز ہو جاتا ہے اسی طرح حالت جنگ میں جان بچانے کے لیے ایسے ہتھیار کا استعمال جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے جو اسلامی اصولوں کی رو سے شاید جائز ہتھیار نہ ہو۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح ہتھیاروں کی جنگ ہے اسی طرح میڈیا کی جنگ بھی ہے بلکہ آج کے دور میں میڈیا کی جنگ کا دائرہ ہتھیاروں کی جنگ سے زیادہ وسیع ہے اور میڈیا ہتھیار سے

زیادہ دشمن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے جہاں ابلاغ کے ذرائع کا وقت کی ضرورت کے مطابق استعمال ضروری ہے وہاں اضطرار اور حالتِ جنگ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ آج عالمی سطح پر جس طرح ''میڈیاوار'' جاری ہے اور اسلام، حضرت محمدؐ کی ناموس و حرمت، اور اسلامی تعلیمات و روایات بین الاقوامی پروپیگنڈے اور کردارکشی کے ہتھیاروں کی زد میں ہیں، اس کے پیش نظر ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ اس ''میڈیاوار'' کو نظر انداز کرنے کی بجائے اس میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہوں اور اسی طرح اس میں حصہ لیں جس طرح غزوۂ خندق کے بعد ذرائع ابلاغ، ادب و خطابت اور شاعری کی جنگ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامور صحابہ کرام حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت ثابت بن قیسؓ نے کردار ادا کیا تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسی زندگی

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ فروری ۲۰۱۳ء)

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روز مرّہ معمولات کا آغاز بھی مجلس سے ہوتا تھا اور اختتام بھی مجلس پر ہی ہوتا تھا۔

عمومی مجلس

صبح نماز کے بعد عمومی مجلس ہوتی تھی اور رات کو عشاء کے بعد خواص کی محفل جمتی تھی جبکہ دن میں بھی مجلس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سیرت اور حدیث کی مختلف روایات میں بتایا گیا ہے کہ نماز فجر کے بعد جناب رسول اللہؐ مسجد میں ہی اشراق کے وقت تک تشریف فرما ہوتے تھے، اس دوران وہ ساتھیوں کا حال احوال پوچھتے تھے، کسی نے خواب دیکھا ہوتا تو وہ بیان کرتا تھا اور تعبیر پوچھتا تھا، خود آنحضرتؐ نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو تعبیر کے ساتھ وہ خواب بیان فرماتے تھے، کوئی تازہ وحی نازل ہوتی تو اس کا ذکر کرتے تھے، کوئی اعلان کرنا ہوتا تو کرتے تھے۔ اس موقع پر مجلس میں دورِ جاہلیت کے واقعات کا تذکرہ ہوتا تھا اور شعر و شاعری کا دور بھی چل جاتا تھا جن میں حضورؐ شریک نہیں ہوتے تھے لیکن سن کر مسکرا دیتے تھے۔ پھر سارا دن مجالس چلتی رہتی تھیں، احکام و مسائل کا تذکرہ ہوتا تھا، ہدایات ہوتی تھیں اور تلاوت اور ذکر و اذکار کا سلسلہ بھی ہوتا تھا

خواص کی مجلس

جبکہ عشاء کے بعد خواص کی مجلس ہوتی تھی۔ اس مجلس کا تذکرہ حضرت علیؓ نے شمائل ترمذی کی ایک روایت کے مطابق یوں کیا ہے کہ خاص خاص احباب عشاء کے بعد نبی اکرمؐ کے اس حجرے میں جمع ہو جاتے تھے جہاں اس رات آپ کا قیام ہوتا تھا، اس میں مختلف علاقوں کی صورتحال پیش کی جاتی تھی، آنحضرتؐ مختلف قبیلوں اور علاقوں کے حالات دریافت کرتے تھے اور لوگوں تک پہنچانے کے لیے

پیغامات دیتے تھے، اس طرح مجموعی صورتحال پر باہمی مشاورت ہوجاتی تھی اور اگلے روز کی تیاری بھی ہوتی تھی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ بہت سے لوگ جو اپنی حاجات اور ضروریات خود جناب رسول اللہؐ کے سامنے پیش نہیں کر پاتے تھے، ان کی ضروریات اور مسائل ہم لوگ رات کی مجلس میں پیش کر دیتے تھے۔

مجالس کا ماحول

جناب نبی اکرمؐ کی مجالس میں ہر طرح کی باتیں ہوتی تھیں اور بے تکلفی کے ماحول میں ہوتی تھیں۔ رسول اکرمؐ کا ادب و احترام صحابہ کرامؓ کے دلوں میں حد سے زیادہ تھا لیکن اس کے باوجود مجلس کا ماحول کھلا رہتا، حضورؐ خود بھی خوش طبعی اور دل لگی فرماتے تھے اور صحابہ کرامؓ بھی آپؐ کے ساتھ بے تکلفی اور خوش طبعی کر لیتے تھے۔

جناب نبی اکرمؐ کے ایک صحابی کا نام حضرت نعیمانؓ ہے، بدری صحابی تھے اور بہت خوش طبع آدمی تھے، ان کی دل لگی کے بہت سے واقعات ان کے تذکرہ میں ملتے ہیں، حتیٰ کہ حضورؐ کے ساتھ بھی دل لگی کر لیتے تھے۔ ایک بار وہ مسجد میں آرہے تھے کہ راستہ میں ایک ریڑھی پر انگور دیکھے، بیچنے والے سے کچھ انگور لیے اور کہا کہ یہ مسجد میں لے جا رہا ہوں، اگر پسند نہ آئے تو واپس کر دوں گا ورنہ تھوڑی دیر کے بعد تم مسجد میں آکر پیسے لے لینا۔

مسجد میں جناب نبی اکرمؐ تشریف فرما تھے۔ نعیمانؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! انگور کھائیں گے؟ فرمایا کھا لیں گے۔ اس نے انگور حضورؐ کے سامنے رکھ دیے، آپؐ نے کھائے اور مجلس میں بیٹھے دوسرے لوگوں نے بھی کھائے۔ تھوڑی دیر میں انگوروں والے نے آکر پیسے مانگے تو نعیمانؓ نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! اس کو پیسے دے دیں۔ فرمایا کس بات کے؟ کہا یہ جو انگور کھائے ہیں ان کے پیسے۔ فرمایا کہ میں نے تو نہیں منگوائے تھے، نعیمانؓ نے کہا کہ کھائے تو ہیں نا! آپؐ نے پیسے دے دیے تو نعیمانؓ نے کہا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کہ اس کے بغیر آپؐ نے انگور کھانے نہیں تھے۔ غرضیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سب دوستوں کے ساتھ بے تکلفانہ ہوتی تھی اور ہر قسم کا ذوق رکھنے والے کو اس میں اپنی تسکین کا سامان مل جاتا تھا۔

نعتیہ شاعری اور ادب و احترام کے تقاضے

(۲۷ مارچ ۲۰۱۴ء کو گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں ''عالمی رابطہ ادب اسلامی''
کے زیر اہتمام نعتیہ شاعری کے حوالے سے منعقدہ ایک سیمینار سے خطاب۔
مطبوعہ روزنامہ اوصاف اسلام آباد، اپریل ۲۰۱۴ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نثر میں ہو یا نظم میں، باعثِ برکت و سعادت ہے اور ذکرِ رسولؐ کے ہزاروں پہلو ہیں جن پر مختلف حوالوں سے علمی کاوشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ نعتیہ شاعری کے بعض پہلوؤں پر میرے پیشرو مقررین نے خوبصورت خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ میں اس کی مقصدیت کے حوالہ سے عرض کرنا چاہوں گا کہ ذکرِ رسولؐ کا مقصد اپنے جذبات اور محبت و عقیدت کا اظہار تو ہوتا ہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی نسبت کا اظہار بھی کرتا ہے اور محبت و عقیدت بھی پیش کرتا ہے۔ لیکن نعتیہ شاعری کا ایک اہم پہلو ہمارے پیشِ نظر ضرور ہونا چاہیے کہ خود جناب نبی اکرمؐ نے اس کا کس حوالہ سے تقاضہ کیا تھا؟

نعتیہ شاعری کی ضرورت

روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ اب قریش کو ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوگی، البتہ وہ خطابت و شعر کا محاذ گرم کریں گے اور تمہارے خلاف عربوں کو بھڑکائیں گے۔ یہ جنگ جو زبان کے ساتھ لڑی جائے گی اس میں کون کون سامنے آئے گا؟ اس پر حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ سامنے آئے جو اپنے وقت کے بڑے شعراء تھے۔ جبکہ خطابت کے محاذ پر حضرت ثابت بن قیسؓ نے مورچہ سنبھالا اور

شعر وخطابت کی یہ جنگ کامیابی کے ساتھ لڑی گئی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اسلام کے دفاع کی جنگ تھی اور جناب رسول اللہؐ کی عزت و ناموس کے تحفظ کی جنگ تھی۔ ان خطباء و شعراء نے حضورؐ کی مدح اور اسلام کی خوبیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ کفار کی طرف سے کی جانے والی ہجو اور اٹھائے جانے والے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دیا اور کفار کے پروپیگنڈے کا رخ پھیر دیا۔

آج بھی ہمیں یہی صورتحال درپیش ہے۔ عالمی سطح پر اسلامی احکام و قوانین، قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر طرح طرح کے اعتراضات دہرائے جا رہے ہیں اور اسلام کے ساتھ ساتھ دیندار لوگوں کی کردار کشی کی مہم بھی ہر سطح پر جاری ہے۔ ان حالات میں نعتیہ شاعری کو بھی اسلام کے دفاع اور حضورؐ کی حرمت و ناموس کے تحفظ کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور حالات کے تقاضے کے پیش نظر اس پہلو کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

اظہارِ جذبات میں احتیاط کی ضرورت

دوسری بات جو میں اس ضمن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نعتیہ شاعری میں اظہارِ جذبات کے لیے جس احتیاط کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے اس کی ضرورت آج زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً حضرت حسان بن ثابتؓ کا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ جب ان کے سامنے حضورؐ نے قریشِ مکہ کے شاعروں کی طرف سے کی جانے والی ہجو کا ذکر کیا تو انہوں نے اپنی زبان ہاتھ میں پکڑ کر کہا کہ میں اس زبان کے ساتھ ان کو چیر کر رکھ دوں گا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں بھی قریش میں سے ہوں، میرے نسب کا کیا کرو گے؟ یعنی قریش کی مذمت کرتے ہوئے مجھے زد میں آنے سے کیسے بچاؤ گے؟ حسان بن ثابتؓ نے کہا کہ آپ کو درمیان سے اس طرح نکال لوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مل کر میرے نسب کی تفصیلات معلوم کرلو تاکہ تم قریش کی ہجو کا جواب دیتے وقت اس کا لحاظ کر سکو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے اس بات کی تلقین فرمائی ہے کہ ان کی مدح و نعت میں ادب و احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

اس سلسلہ میں مجھے اپنے طالب علمی کے دور کا ایک واقعہ نہیں بھولتا کہ گوجرانوالہ میں بہت سے شعراء کرام تھے جو ادبی اور شعری محفلوں کا اہتمام کیا کرتے تھے جن میں اثر لدھیانوی، عزیز لدھیانوی، بیکس فتح گڑھی، راشد بزمی، اور دوسرے شعراء شامل تھے۔ یہ سب اب مرحوم ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ یہ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ کی بات ہے، میں بھی ان کی محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ میں شعر کہتا تو نہیں تھا البتہ ادبی محفلوں کا ذوق ضرور رکھتا تھا۔ ان دنوں پل لکڑ والا کے قریب ایک بزرگ ٹیلر ماسٹر تھے اور شہید جالندھریؒ کے نام سے شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے ہاں شعراء کی محفل تھی اور مولانا ظفر علی خان مرحوم کی مشہور نعت کا مصرعہ

دل زندہ جس سے ہے وہ تمنا تمھی تو ہو

کو طرح مصرعہ بنا کر بہت سے شعراء نے اس محفل میں نعتیہ کلام پیش کیا مگر شہید جالندھری مرحوم نے اس مصرع سے اختلاف کیا اور کہا کہ ''تمھی تو ہو'' کا انداز خطاب بہت زیادہ بے تکلفانہ ہے اور میرا جی نہیں چاہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لہجے میں خطاب کروں۔ انہوں نے اپنی نظم یا نعت میں اسے ''آپ ہی تو ہیں'' کے جملہ سے تبدیل کر دیا اور اس کے مطابق آپؐ کی بارگاہ میں ہدیۂ نعت پیش کیا۔ یہ بات انہوں نے اس انداز سے کہی کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی اور نصف صدی گزر جانے کے باوجود ان کا انداز بلکہ ان کا سراپا اب تک ذہن میں نقش ہے۔ مجھے ان کی یہ بات بہت اچھی لگی اور میں ایسے موقع پر اس کا تذکرہ ضرور کیا کرتا ہوں۔

اس لیے گزارش ہے کہ نعتیہ شاعری میں اسلام اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منفی پراپیگنڈے کے جواب کا پہلو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ادب و احترام کے تقاضوں کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کہ

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

تذکرۂ رسولؐ کے مقاصد اور آداب

(۳ مئی ۲۰۱۴ء کو جامعہ سرور کونینؐ بادامی باغ لاہور میں منعقدہ
محفلِ حمد و نعت سے خطاب۔ مطبوعہ روزنامہ اسلام لاہور، ۸ مئی ۲۰۱۴ء))

بعد الحمد والصلوٰۃ۔

تذکرۂ رسولؐ کے مقاصد

- جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک ہم اپنی نسبت کے اظہار اور شناخت کے لیے کرتے ہیں کہ اس سے انسانی سوسائٹی کی رنگا رنگ تقسیم میں ہمارا تعارف ہو جاتا ہے اور آپؐ کے ساتھ نسبت کے اظہار کے بعد مزید کسی تعارف کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔
- ہم یہ تذکرہ محبت کے اظہار کے لیے بھی کرتے ہیں کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی اکثر زبان پر رہتا ہے۔ اور یہ ذکر کرنا نہیں پڑتا بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے کہ محبت اپنا اظہار خود کرتی ہے اور اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔
- اس کے ساتھ ہم جناب نبی اکرمؐ کا تذکرہ برکتوں اور رحمتوں کے حصول کے لیے کرتے ہیں کہ جہاں آقائے نامدار کا ذکر ہوتا ہے وہاں رحمتوں اور برکتوں کا صرف نزول نہیں ہوتا بلکہ بارش ہوتی ہے۔
- جبکہ ہم جناب رسول اللہؐ کا ذکر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بھی کرتے ہیں کہ آپؐ کے ذکر سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔

تذکرۂ رسولؐ کے آداب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نثر میں ہو یا نظم میں، مدح و نعت کی صورت میں ہو یا رہبری و راہنمائی کے حوالہ سے ہو، ہر طرح باعثِ برکت ہے۔ لیکن اس مبارک تذکرہ کے کچھ آداب ہیں

جنہیں ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ آداب اور تقاضے قرآن کریم نے بھی بیان کیے ہیں اور خود حضورؐ نے بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا اس وقت مناسب سمجھتا ہوں۔

تخاطب کا لحاظ

مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

لا تجعلوا دعآء الرسول بینکم کدعآء بعضکم بعضا۔ (النور ٦٣)

"رسولؐ کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کے بلانے جیسا نہ سمجھو۔"

اس کے مختلف معانی مفسرین کرامؒ نے بیان کیے ہیں، مثلاً:

۱. ایک یہ کہ جناب رسول اللہؐ کی دعا عام آدمی کی دعا کی طرح نہیں ہے۔
۲. دوسرا معنٰی یہ ہے کہ حضورؐ کسی کو بلائیں تو ان کا بلانا عام آدمی کے بلانے کی طرح نہیں ہے۔
۳. اور تیسرا معنٰی یہ ہے کہ حضورؐ کو اس طرح بے تکلفی سے نہ پکارو جس طرح ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

یہ مقامِ ادب ہے حتٰی کہ اس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ اگر مجلس میں تمہاری آواز رسول اللہؐ کی آواز سے بلند ہوگئی تو یہ سوءِ ادب تصور ہوگی اور تمہاری نیکیاں اس طرح برباد ہو جائیں گی کہ تمہیں شعور تک نہ ہوگا۔

اس پر مجھے اپنا بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا ہے کہ ہمارے طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ میں ایک نعتیہ مشاعرہ تھا جس میں طرح مصرعہ یہ تھا:

ع دل زندہ جس سے ہے وہ تمنا تمھی تو ہو

یہ مولانا ظفر علی خان مرحوم کی ایک معروف نعت کا مصرعہ ہے۔ مگر ایک شاعر شہید جالندھری مرحوم نے یہ کہہ کر مصرعہ بدل لیا کہ میرا حضورؐ کو "تمھی تو ہو" کہہ کر خطاب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اسے "آپ ہی تو ہیں" میں تبدیل کر رہا ہوں۔ اس شاعر کی یہ بات میرے دل میں ایسی پیوست ہوئی کہ آج تک وہ منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہے۔ اس لیے نعت میں یا خطابت میں آنحضرتؐ کا تذکرہ اس طرح کی بے تکلفی کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے جیسی ہم آپس میں روا رکھتے ہیں اور ادب واحترام کے تقاضوں کو ہر طرح سے ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اسلامی عقائد کا لحاظ

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ ایک عید کے موقع پر انصار مدینہؓ کے کسی گھر میں گئے، وہاں چھوٹی بچیاں اپنے بڑوں کو یاد کر کے نظمیں گا رہی تھیں۔ حضورؐ سنتے رہے لیکن جب ایک بچی نے یہ پڑھا وفینا نبی یعلم ما فی غد کہ ہمارے درمیان ایک پیغمبر موجود ہیں جو آنے والے کل کی بات بھی جانتے ہیں تو آپؐ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ بیٹی! اس کو چھوڑ دو اور باقی جو کچھ پڑھ رہی ہو، پڑھتی رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ کا تذکرہ کرتے ہوئے عقائد کا بالخصوص عقیدۂ توحید کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور کوئی ایسی بات آپؐ کے حوالہ سے نہیں کہنی چاہیے جو عقیدہ کے منافی ہو اور اس سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر زد پڑتی ہو۔

نسب و تعلق کا لحاظ

اس کے ساتھ ہی یہ روایت بھی ہے کہ جب جناب نبی اکرمؐ کے خلاف نعوذ باللہ عرب شاعروں کی طرف سے کی جانے والی ہجو کا جواب دینے کے لیے حضرت حسان بن ثابتؓ نے عزم کا اظہار کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! میں اپنی زبان کے ساتھ قریش کے شاعروں کو چمڑے کی طرح چیر کر رکھ دوں گا تو حضورؐ نے فرمایا کیف و فیھم نسبی؟ کہ ان کی مذمت کیسے کرو گے جبکہ میرا نسب بھی ان میں ہے؟ تو حضرت حسانؓ نے کہا کہ میں قریش کی ہجو کرتے ہوئے آپ کو ایسے نکال لوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ اس پر حضورؐ نے انہیں ہدایت کی کہ وہ حضرت ابوبکرؓ سے مل کر ان سے نسب نامہ کی تفصیل معلوم کر لیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریش کی مذمت کرتے ہوئے آپؐ کی ذاتِ گرامی بھی غیر شعوری طور پر زد میں آجائے۔

اس لیے میں نعت خوان حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نعتِ رسولؐ کا ناگزیر تقاضہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی عقائد بالخصوص توحید کا خیال رکھا جائے۔ اور حضورؐ کا تذکرہ اس طرح بے تکلفانہ انداز میں نہ کیا جائے جیسے ہم آپس میں ایک دوسرے کا کرتے ہیں اور آپؐ کے تذکرہ میں سوءِ ادب کے ہر ممکنہ پہلو سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

تذکرۂ نبوی ﷺ کے چند آداب

(۲۲ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو جامعہ اسلامیہ محمدیہ فیصل آباد میں
اساتذہ وطلبہ سے خطاب۔ مطبوعہ ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، نومبر ۲۰۱۵ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ بزرگانِ دین کا تذکرہ محبت و برکت کے علاوہ راہنمائی کیلئے بھی ہوتا ہے۔ بلکہ قرآن کریم نے ہمیں احکام و قوانین پر براہِ راست عمل کرنے کی بجائے بزرگانِ دین کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے نقش قدم پر چلنے کو صراط مستقیم قرار دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی (لقمان ۱۵) کہ ان لوگوں کے راستے پر چلو جو میرے سامنے جھک گئے۔

بزرگانِ دین کا تذکرہ، ایک دینی تقاضہ

اس لیے بزرگانِ دین کا تذکرہ ہمارے لیے ایک دینی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہماری مجالس و محافل میں ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ گزشتہ ماہ سیدنا عثمان بن عفانؓ کی شہادت کے حوالہ سے ان کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اس ماہ کے آغاز میں سیدنا حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ کی شہادت اور ان کی فضیلت و منقبت موضوع گفتگو رہی۔ اور آج کل سیدنا حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کا تذکرہ کر کے ان کے ساتھ محبت وعقیدت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

بزرگوں کے دن منانا یا کچھ ایام کو ان کی یاد کیلئے مخصوص کر دینا تو کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن انہیں یاد کرنا اور ان کی خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ کرتے رہنا رحمتوں اور برکتوں کا ذریعہ بنتا ہے اور اس سے راہنمائی ملتی ہے۔ اس مناسبت سے میں اس کے ایک پہلو پر بھی کچھ عرض کر رہا ہوں کہ بزرگوں کے تذکرہ کے کچھ آداب اور کچھ تقاضے بھی ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اسلام کے مسلّمہ عقائد کا لحاظ

ہم سب سے زیادہ تذکرہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتے ہیں اور انہی کا سب سے زیادہ تذکرہ کرنا چاہیے۔ مگر قرآن کریم نے اس کے کچھ آداب بیان کیے ہیں اور خود حضورؐ نے بھی چند آداب کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے صرف دو تین کا حوالہ دینا چاہوں گا، اس وجہ سے کہ آج کل حمد و نعت کی محفلیں عام ہو گئی ہیں اور شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ خطابت میں بھی حمد و نعت اور منقبت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے کے مطابق اس سلسلہ میں افراط و تفریط کا رنگ غالب ہو گیا ہے جس کی طرف توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ عید کے روز جناب رسول اللہؐ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں آرام فرما رہے تھے کہ انصار کی کچھ بچیاں اپنے ان بزرگوں کو شعروں کی صورت میں یاد کرتے ہوئے ترنّم کے ساتھ اشعار پڑھ رہی تھیں جو گزشتہ جنگوں میں قتل ہو گئے تھے۔ عید خوشی کا دن بھی ہوتا ہے اور بچھڑے ہوئے بزرگوں کو یاد کرنے کا دن بھی ہوتا ہے کہ اس دن بچھڑے ہوئے لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ وہ بچیاں اپنے اس شغل میں مصروف تھیں کہ حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے اور یہ منظر دیکھ کر بچیوں کو منع کرنا چاہا مگر آپؐ نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ رہنے دیں بچیاں ہیں اور عید کا دن ہے۔ لیکن جب انہی بچیوں نے اشعار پڑھتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا کہ و فینا نبی یعلم ما فی غد کہ ہمارے درمیان ایسا نبی موجود ہے جو آنے والے کل کے حالات بھی جانتا ہے، تو جناب نبی اکرمؐ نے خود انہیں روک دیا کہ یہ بات نہ کہو اور باقی جو کچھ کہہ رہی ہو کہتی رہو۔

حضورؐ نے بچیوں کو یہ مصرعہ کہنے سے اس لیے روک دیا تھا کہ اس سے عقیدۂ توحید پر زد پڑتی تھی۔ اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ بزرگوں کے تذکرہ حتیٰ کہ حضورؐ کی مدح میں بھی اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اس سے اسلام کے کسی مسلّمہ عقیدہ پر زد نہ پڑتی ہو۔

بزرگوں کا ادب و احترام

دوسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے کہ قریش کے شاعروں نے جب غزوۂ احزاب میں ناکامی کے بعد جناب نبی اکرمؐ کی مخالفت اور نعوذ باللہ ہجو میں اضافہ کر دیا تو ان کے جواب کیلئے حضرت

حسان بن ثابتؓ سامنے آئے اور ایک موقع پر اپنے جذبات کا اظہار اس طرح فرمایا کہ میں اپنی زبان کے ساتھ ان قریشیوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ حسانؓ! میں بھی تو قریشی ہوں، حضرت حسانؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں قریش کی مذمت کرتے ہوئے آپ کو درمیان سے ایسے نکال دوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن آپؐ نے صرف اتنی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حضرت حسانؓ سے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس بیٹھ کر ان سے میری رشتہ داریوں کی تفصیل معلوم کر لو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کہیں انجانے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دو جس سے جناب رسول اکرمؐ کے لیے سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہو۔

یہ بات میں نے اس لیے عرض کی ہے کہ ہم مدح و منقبت میں اور کافروں کی مذمت میں بھی اس بات کے پابند ہیں کہ انتہائی احتیاط سے بات کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ کہیں انجانے میں اور بے دھیانی میں بھی کوئی بے احتیاطی نہ ہو جائے۔ جبکہ ہمارے ہاں شعر و شاعری اور خطابت دونوں دائروں میں اس امر کا لحاظ رکھنا کم ہوتا جا رہا ہے اور ہم ہر وہ بات کہہ دیتے ہیں جو کسی طرح ہمارے ذہنوں میں آ جاتی ہے۔ ہمیں اس طرف توجہ دینی چاہیے اور حد درجہ احتیاط کا اہتمام کرنا چاہیے۔

انبیاء کرامؑ کے آپس میں تقابل سے گریز

جبکہ تیسری بات بھی بخاری شریف کے حوالہ سے ہی ذکر کروں گا کہ ایک موقع پر ایک انصاری صحابیؓ نے ایک یہودی کو اس بات پر تھپڑ مار دیا تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سارے انسانوں پر فضیلت کی بات کہہ دی تھی۔ انصاری صحابیؓ کو غصہ آیا کہ یہ شخص حضرت موسیٰؑ کو حضرت محمدؐ پر بھی فضیلت دے رہا ہے اور اس غصے میں انصاری صحابہؓ نے اس یہودی کو تھپڑ مار دیا۔ وہ یہودی جب شکایت لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے حضرت موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو۔ اس لیے کہ قیامت کے دن جب سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے تو میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا جبکہ حضرت موسیٰؑ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہوں گے۔ ممکن ہے وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ چکے ہوں گے یا بے ہوش ہی نہیں ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ دنیا میں کوہِ طور پر ایک

بار اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلی کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے تھے، اس لیے شاید قیامت کے دن کی بے ہوشی سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہوں۔ یہی بات حضورؐ نے ایک موقع پر حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمائی کہ مجھے ان پر فضیلت نہ دو۔ بلکہ ایک موقع پر فرمایا لا تخیرونی من بین الانبیاء کہ مجھے انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان فضیلت نہ دو۔

اس پر سوال اٹھتا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کے درمیان فضیلت کی بات تو خود قرآن کریم کہتا ہے تلک الرسل فضلنا بعضهم علیٰ بعض (البقرہ ۲۵۳) کہ ہم نے بعض انبیاءؑ کو بعض دوسرے انبیاءؑ پر فضیلت دی ہے۔ اور سب انبیاء کرامؑ پر اپنی فضیلت اور برتری کا ذکر خود جناب رسول اللہؐ نے فرمایا ہے جو بیسیوں احادیث میں موجود ہے۔ اور ہم اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضورؐ کو علی الاطلاق تمام انبیاء کرامؑ پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر آپؐ نے خود کو انبیاء کرامؑ بالخصوص حضرت موسیٰؑ اور حضرت یونسؑ پر فضیلت دینے سے منع کیوں فرمایا ہے؟

شارح بخاری حضرت علامہ قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ مطلق فضیلت بیان کرنے سے منع نہیں کیا بلکہ ایسی فضیلت بیان کرنے سے روکا ہے کہ جس سے دوسرے بزرگ کی اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی نبیوں کا آپس میں تقابل نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ تقابل کی صورت میں دوسری طرف کچھ نہ کچھ اہانت یا تخفیف کا پہلو ضرور نکل آتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں یہ ذوق عام ہوتا جارہا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ ہوں یا حضرات صحابہ کرامؓ ہوں ہم دو بزرگوں یا دو گروہوں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے تولنا شروع کر دیتے ہیں اور بسا اوقات وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بزرگوں کا تذکرہ صحیح طریقہ سے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

سیرتِ طیبہ اور امنِ عامہ

(۳ مئی ۲۰۱۴ء کو جمعیت علماء اہلِ سنت گجرات کے زیر اہتمام علاقہ کے فضلاء کی سالانہ تقریبِ دستار بندی کی سے خطاب۔ مطبوعہ روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳ جنوری ۲۰۱۵ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھ سے پہلے اپنی گفتگو میں حضرت مولانا مفتی محمد طیب نے امنِ عامہ کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے اس پہلو پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ آنحضرتؐ نے دس سالہ مدنی زندگی میں جہاں بہت سے غزوات کی قیادت فرمائی ہے اور جہاد و قتال کیا ہے وہاں دوسری قوموں کے ساتھ بہت سے معاہدات بھی کیے ہیں۔ اور باہمی صلح و امن کے معاملات بھی فرمائے ہیں جن کا آغاز میثاق مدینہ سے ہوا تھا اور اس کے بعد درجنوں اقوام کے ساتھ وقتاً فوقتاً معاہدے کیے گئے۔

میں بھی اسی گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا اور یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرمؐ نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی ہے، معاشرہ میں منافرت اور فساد کو پھیلنے سے روکا ہے، اور عام لوگوں کے امن کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات واحساسات کا بھی پوری طرح لحاظ رکھا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں فساد کا ذریعہ بننے والی باتوں کی جناب رسول اللہؐ نے سختی کے ساتھ نفی فرمائی ہے اور ان کی مذمت کی ہے۔ اس حوالہ سے بیسیوں واقعات میں سے ایک دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

ردعمل سے پہلے خبر کی تحقیق

قبیلہ بنو مصطلق کی طرف زکوٰۃ وعشر کی وصولی کے لیے آنحضرتؐ کی طرف سے تشریف لے جانے والے عامل کا استقبال کرنے کے لیے قبیلہ کے لوگ مسلح ہو کر گاؤں سے باہر جمع ہوئے تو مدینہ منورہ سے تشریف لانے والے بزرگ انہیں ہتھیار بکف دیکھ کر مغالطہ کا شکار ہو گئے کہ یہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی واپس مدینہ کی طرف لوٹ گئے، انہوں نے جب کچھ لوگوں کو بتایا کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں تو مدینہ میں کھلبلی مچ گئی اور لوگ ردعمل میں اس

قبیلہ کے خلاف کاروائی کا تقاضہ کرنے لگے۔ اتنے میں قبیلہ کے سردار بھی مدینہ منورہ پہنچ گئے اور وضاحت کی کہ ہم قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ استقبال اور پروٹوکول کے لیے ہتھیار بکف ہوکر جناب رسول اللہؐ کے قاصد کے انتظار میں بستی سے باہر کھڑے تھے۔

اس موقع پر قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہوا کہ اے ایمان والو! جب اس قسم کی کوئی خبر آئے تو رد عمل میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے خبر کی تحقیق کر لیا کرو، تاکہ کسی قوم کے خلاف کاروائی کر ڈالنے کے بعد یہ معلوم کر کے تمہیں شرمندگی نہ ہو کہ وہ خبر تو صحیح نہیں تھی۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ کوئی جھوٹی سچی خبر سنتے ہی موبائل فونوں کا میسج سسٹم متحرک ہو جاتا ہے اور ٹی وی چینلوں پر پٹیاں چل جاتی ہیں۔ چند گھنٹوں میں وہ خبر ہر طرف پھیل کر اپنا کام دکھا چکتی ہے، اور فساد و جدال کے معرکے بپا ہو چکتے ہیں تو دوسرے دن پتہ چلتا ہے کہ وہ میسج درست نہیں تھا اور وہ ٹی وی کی پٹی تحقیق کے بغیر تھی۔ آج معاشرے میں ہر طرف پھیلنے والے فساد و قتال پر قابو پانے کے لیے ہمیں خبر کی تحقیق کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ میسج اور پٹی کی اس وبا کو کنٹرول کرنا ہوگا اور حضورؐ کے اس ارشاد گرامی کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا ہوگا کہ:

> ''کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو تحقیق کے بغیر آگے بیان کر دے۔''

عوامی تاثر کا لحاظ

ہمارے ہاں ایک اور بیماری پھیلتی جا رہی ہے کہ تکفیر اور اس کی بنیاد پر قتل کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ فلاں کافر ہے اسے قتل کر دو، اور فلاں مرتد ہے اس لیے واجب القتل ہے۔ جبکہ اس حوالہ سے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ میں علماء کرام کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ آپؐ کو مدینہ منورہ میں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھ اس کے سینکڑوں ساتھیوں کی ریشہ دوانیوں کا مسلسل سامنا رہا۔ ان لوگوں پر خود قرآن کریم نے وماھم بمؤمنین (البقرہ ۸) کہہ کر کفر کا فتویٰ لگایا۔ اسلام اور رسول اکرمؐ کے خلاف ان کی متعدّد سازشیں ثابت ہوگئیں مگر آپؐ نے انہیں قتل نہیں کیا۔ بلکہ حضرت عمرؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور دیگر صحابہ

کرامؓ کی درخواست کے باوجود انہیں قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور قتل نہ کرنے یا اس کی اجازت نہ دینے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمدؐ تو اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنے لگے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اقدام کا اپنی جگہ صحیح ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی دیکھنا سنتِ نبویؐ ہے کہ اس کے عمومی اثرات کیا ہوں گے اور دنیا والے اس کا کیا مطلب سمجھیں گے ؟

عمومی اثرات و نتائج کا لحاظ

اسی طرح قریش کی طرف سے خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران بیت اللہ کی ابراہیمی بنیادوں کو نظر انداز کر دینے پر حضورؐ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے اس خواہش کا برملا اظہار فرمادیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی عمارت کو شہید کر کے اسے دوبارہ ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر دوں۔ لیکن ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ قوم قریش نئی نئی مسلمان ہوئی ہے، یہ اس بات کو محسوس کریں گے کہ ان کا تعمیر کردہ بیت اللہ شہید کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ کسی بھی کام کے عمومی اثرات کا لحاظ رکھنا اور عام لوگوں کے جذبات و احساسات کا احترام کرنا بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو اسوۂ نبویؐ کے اس پہلو کو سامنے رکھنے کی صورت میں ہم معاشرتی فساد اور باہمی قتل و قتال کے بہت سے معاملات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

علماء کرام سے گزارش ہے کہ آج کے حالات کے تناظر میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ کے ان پہلوؤں کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ کیونکہ جس دلدل میں قومی سطح پر ہم بری طرح پھنس چکے ہیں اس سے نکلنے کا راستہ یہی ہے۔

رسول اکرم ﷺ بطور سیاستدان

(۱۵ جنوری ۲۰۱۵ء کو باغِ جناح لاہور کی دارالسلام لائبریری کے زیرِ اہتمام قائداعظم پبلک لائبریری کے ہال میں منعقدہ سیمینار بعنوان ''رسول اکرمؐ بحیثیت سیاستدان'' سے خطاب۔
مطبوعہ روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۲ جنوری ۲۰۱۵ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب سرورِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی سب سے بڑی صاحبِ کمالات شخصیت ہیں اور آپ کو کمال کی ہر صفت عروج کے اعلیٰ ترین درجہ پر عطا ہوئی ہے۔ آپ سب سے بڑے رسول و نبی ہیں، سب سے بڑے قانون دان ہیں، سب سے بڑے جرنیل ہیں، سب سے اعلیٰ حکمران ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے سیاست دان بھی ہیں۔

سیرتِ طیبہؐ کے سیاسی پہلو پر کام کی ضرورت

آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کے مختلف اور متنوع پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک پر مستقل کام کی ضرورت ہے اور ہمارے ہاں سیرتِ نبویؐ کے ان پہلوؤں پر سب سے کم کام ہو رہا ہے۔ ہم نے قرآن کریم کی طرح جناب رسول اللہؐ کی سنت و سیرت کو بھی صرف برکت و رحمت اور اجر و ثواب کے حصول کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اکرمؐ کا تذکرہ برکات و فیوض، رحمتوں اور اجر و ثواب کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اس کا اصل مقصد راہنمائی حاصل کرنا ہے اور اپنے مسائل و مشکلات کا حل اس میں سے تلاش کرنا ہے، جس کی طرف ہماری توجہ بہت ہی کم ہے۔

- سیاسیات کے حوالے سے آنحضرتؐ کی تعلیمات کا ایک حصہ وہ ہے جن میں اسلام کے سیاسی نظام کا تعارف کرایا گیا ہے، اسلامی ریاست کی بنیادوں کا تعیّن کیا گیا ہے اور ایک مسلم حکومت کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔ رسول اکرمؐ کی سینکڑوں احادیث اس سلسلہ میں موجود ہیں۔
- جبکہ دوسرا حصہ یہ ہے کہ آپؐ نے ایک سیاستدان اور حاکمِ وقت کے طور پر سینکڑوں فیصلے

کیے ہیں جن میں سے ہر فیصلہ ہمارے لیے سرمۂ بصیرت اور راہنمائی کا سرچشمہ ہے، بشرطیکہ ہم ان فیصلوں اور واقعات کو سیاسی حکمت و تدبر کے تناظر میں دیکھیں اور ان میں اپنے دور کی مشکلات و مسائل کا حل تلاش کرنے کا ذوق ہم میں بیدار ہو جائے۔

اسلام کا سیاسی نظام

آج کی محفل میں سیرتِ طیبہؐ کے اول الذکر پہلو کے بارے میں چند معروضات پیش کرنا چاہوں گا جس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے سیاسی اصولوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور اسلامی ریاست و حکومت کے فرائض اور حقوق کی وضاحت کی ہے۔

خلافت، انبیاء کرامؑ کی نیابت

جناب رسول اللہؐ نے اسلام کے سیاسی نظام کا تعارف بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس طرح کرایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاست و حکومت کے فرائض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سر انجام دیتے تھے، ایک نبی چلا جاتا تو دوسرا اس کی جگہ آجاتا۔ یعنی سیاست و حکومت کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوتی تھی۔ لیکن میرے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور کوئی نیا نبی اب نہیں آئے گا، اس لیے میرے بعد سیاست و حکومت کا نظام خلفاء کے سپرد ہو گا۔

چنانچہ رسول اکرمؐ کے بعد خلافت کا یہ نظام قائم ہوا اور مسلمانوں کی ریاست و حکومت کی بنیاد بنا۔ اسلامی خلافت کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں ملک کا نظام چلایا جائے اور امتِ مسلمہ کے اجتماعی امور سر انجام دیے جائیں، جیسا کہ خلفاء راشدینؓ اور ان کے بعد خلفاء کرام کرتے رہے ہیں۔

قیامِ خلافت کا طریق کار

خلافت کے بارے میں ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ خلافت کیسے قائم ہو گی اور خلیفہ کا تقرر کون کرے گا؟ اس کے لیے میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیا کرتا ہوں کہ جناب رسول اللہؐ کے بعد وہ اسلامی ریاست و حکومت کے سربراہ کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ منصب نہ تو طاقت کے زور پر حاصل کیا تھا اور نہ ہی بادشاہی نظام کی طرح خاندانی

استحقاق کی بنیاد پر انہیں حکومت ملی تھی۔ بلکہ امت کی اجتماعی صوابدید اور عمومی مشاورت ان کے منصبِ خلافت کی اساس تھی۔ اس لیے خلافت کا قیام امت کی اجتماعی صوابدید کی بنیاد پر ہی عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

جناب نبی اکرمؐ کی سنتِ مبارکہ میں ہمیں نمائندگی کا اصول بھی ملتا ہے کہ ایک موقع پر بنو ہوازن کے قیدی واپس کرنے کے لیے جب ہزاروں افراد سے براہ راست رائے لینا مشکل نظر آیا تو آپؐ نے عرفاء کو درمیان میں ڈالا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کی رائے معلوم کر کے بتائیں تاکہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جا سکے۔ یعنی آنحضرتؐ نے عوام کی اجتماعی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعے معلوم کی۔ عرفاء اور نقباء کی یہ اصطلاح قدیم سے چلی آ رہی ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے نمائندگی کا یہ طریقہ بھی اسلامی ریاست کی ایک اہم بنیاد بن جاتا ہے۔

فلاحی ریاست کا تصور

لیکن میں اس وقت سب سے زیادہ توجہ اسلامی ریاست کے اس پہلو کی طرف دلانا چاہوں گا کہ رسول اکرمؐ نے ایک فلاحی اور رفاہی ریاست کا نظام دیا جسے آج کی دنیا میں ویلفیئر سوسائٹی کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے ایک حدیث کے مطابق ارشاد فرمایا کہ معاشرہ میں جو لوگ بوجھ تلے دبے ہیں یا بے سہارا ہیں، وہ میری ذمہ داری ہیں۔ یعنی ان کی کفالت بیت المال کرے گا۔ چنانچہ جناب نبی اکرمؐ کے دور میں اور پھر خلفاء راشدینؓ کے دور میں بیت المال کا یہ نظامِ کفالت اس قدر مستحکم ہو گیا تھا کہ پورے ملک کے بے روزگاروں، معذوروں اور بے سہارا لوگوں کی کفالت بیت المال کے ذمہ سمجھی جاتی تھی اور یہ ضروریات بطریقِ احسن پوری کی جاتی تھیں۔

اسلامی ریاست کے تین بنیادی اصول

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد جناب رسول اللہؐ کے ارشادات کے مطابق تین اصولوں پر ہے:

۱۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی اطاعت ریاست و حکومت کی سب سے

بڑی اساس ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ حکومت کا قیام امتِ مسلمہ کی صوابدید پر عوامی مشاورت کے ذریعہ ہو گا۔

۳۔ اور تیسرا یہ کہ اسلامی حکومت نظمِ مملکت کو چلانے کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اجتماعی کفالت اور تمام شہریوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔

اگر ہم ان اصولوں کو سامنے رکھ کر پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی طرف پیشرفت کریں تو قیامِ پاکستان کے اس مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے جس کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں کے بعد یہ وطنِ عزیز وجود میں آیا تھا۔

رسول اکرم ﷺ کا منافقین کے ساتھ طرز عمل

(۱۳فروری ۲۰۱۵ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں خطبہ جمعۃ المبارک۔
مطبوعہ روزنامہ اسلام لاہور، ۱۵فروری ۲۰۱۵ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور اسے اپنا مرکز بنایا تو یہود اور مشرکین کے مختلف قبائل کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک ایسے طبقہ سے بھی واسطہ پڑا جو کلمہ پڑھ کر بظاہر مسلمانوں میں شامل ہو گیا تھا لیکن دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا، اور اس کی تمام تر ہمدردیاں اور معاونتیں کفار کے ساتھ تھیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر موجود ہے۔

منافقینِ مدینہ کا کردار

- غزوۂ اُحد میں یہ لوگ تین سو کی تعداد میں عبد اللہ بن اُبی کی سرکردگی میں میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے، جس سے آبادی میں اس وقت ان کے تناسب کا اندازہ ہوتا ہے۔
- پھر مختلف اوقات میں ان کی شرارتیں اور منافقانہ حرکات سامنے آتی رہیں جن میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹی تہمت بھی شامل ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اس شرپسندانہ الزام کی صفائی قرآن کریم نے پیش کی۔
- ایک موقع پر انہوں نے مل بیٹھ کر یہ سازش بھی کی کہ وہ مدینہ منورہ سے مہاجرین کو واپس چلے جانے پر مجبور کر دیں گے۔ اس سازش کی خبر جب آنحضرتؐ کو حضرت زید بن ارقمؓ نے دی تو ان لوگوں نے قسمیں اٹھا اٹھا کر حضورؐ کے سامنے اپنی سچائی کا اتنی شدت سے اظہار کیا کہ آپؐ نے حضرت زید بن ارقمؓ کو ڈانٹ دیا۔ اس پر قرآن کریم کی سورۃ المنافقون نازل ہوئی اور اللہ

تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ زید بن ارقمؓ کی رپورٹ سچی ہے اور یہ لوگ جھوٹی قسمیں اٹھا رہے ہیں۔

- ایک مرحلہ میں ان منافقین نے مدینہ منورہ میں ''مسجد'' کے نام سے اڈہ قائم کر لیا جسے قرآن کریم نے مسجد ضرار سے تعبیر کر کے رسول اکرمؐ کو وہاں جانے سے منع کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسجد کے نام پر قائم ہونے والا یہ مرکز مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے اور دشمنوں کو گھات فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے، چنانچہ حضورؐ نے اسے مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔

جناب رسول اللہؐ کی دس سالہ مدنی زندگی کے دوران منافقین کی اس قسم کی شرارتیں اور سازشیں عام رہیں جن کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے اور احادیث میں بھی ان کی بہت سی تفصیلات مذکور ہیں۔ جبکہ قرآن کریم نے وما هم بمؤمنين اور انهم لكاذبون کہہ کر واضح طور پر کہہ دیا کہ یہ مسلمان نہیں ہے اور ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان سے بچ کر رہنے کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کو سورۃ التحریم میں یہ کہہ کر ان کے خلاف سخت جہاد کرنے کا حکم بھی دیا گیا جاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم (التحریم ۹) کہ ان کے ساتھ جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔

حکمت کا جہاد

لیکن یہ بات توجہ طلب ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے منافقین کے خلاف جہاد کا کونسا طریقہ کار اختیار کیا؟ یہ لوگ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے ساتھ رہے، مسجد نبویؐ میں نمازیں پڑھتے تھے، حضورؐ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے، اور معاشرتی زندگی میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ پوری طرح شریکِ کار رہے ہیں۔

آنحضرتؐ نے ان میں سے کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت مانگی مگر آپؐ نے اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ بظاہر کلمہ پڑھتے ہیں اس لیے انہیں قتل کرنے سے دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ محمدؐ اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنے لگے ہیں۔

ان میں سے کسی کو قتل کرنا تو درکنار حضورؐ نے ایک درجن سے زائد ان منافقین کے نام ظاہر

کرنے سے انکار کر دیا جنہوں نے ایک سفر سے واپسی پر آپؐ کو شہید کرنے کے لیے ویرانے میں گھات لگائی تھی اور ننگی تلواروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان کا یہ حملہ ناکام ہوا مگر حضورؐ نے ان سب کو پہچان لیا تھا اور اپنے ساتھی حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو اس شرط پر سب کے نام بتا بھی دیے تھے کہ وہ کسی اور کو ان میں سے کسی کا نام نہیں بتائیں گے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں بالخصوص حضرت عمرؓ کے شدید اصرار کے باوجود انہوں نے زندگی بھر ان میں سے کسی کا نام افشاء نہیں کیا۔

یہ جناب نبی اکرمؐ کی حکمتِ عملی تھی کہ منافقین کی تمام تر شرارتوں اور سازشوں کے باوجود اُن کے خلاف ''جہاد اور سختی'' کے قرآنی حکم کی تعمیل کے لیے آنحضرتؐ نے تدبر اور حکمت کا راستہ اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ منورہ میں کوئی معاشرتی خلفشار پیدا نہیں ہوا اور منافقین رفتہ رفتہ بے اثر ہو کر سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ خلفاء راشدینؓ کے دور میں ایک طبقہ کے طور پر ان کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا اور وہ نسیاً منسیا ہو کر رہ گئے تھے۔

منافقین کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکیمانہ طرز عمل سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جہاد صرف لڑنے کا نام نہیں بلکہ حکمتِ عملی کے ساتھ دشمن کو ناکام بنا دینا بھی جہاد کہلاتا ہے اور کھلے کافروں کے ساتھ جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان کا ''کلمہ گو کافروں'' کے ساتھ اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ یہ بات نقصان دہ اور اسلام کی دعوت و تبلیغ میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔ اس لیے آج کے حالات میں ہمیں حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے ان معاملات پر اپنے طرز عمل کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہیے۔

رسول اکرم ﷺ کی معاشرتی اصلاحات

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۴ دسمبر ۲۰۱۵ء)

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت اور عقیدت و محبت کا اظہار ہمارے ایمانی تقاضوں میں سے ہے اور ہر مسلمان کسی نہ کسی انداز میں اس کا اظہار ضرور کرتا رہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ جناب رسول اللہؐ کی بعثت کن مقاصد کے لیے ہوئی تھی؟ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ نے انسانی معاشرہ کو خیر کے کن کاموں کی تلقین کی تھی، شر کے کن کاموں سے روکا تھا، اور بھرپور محنت کے ساتھ انسانی سوسائٹی کو کن تبدیلیوں اور اصلاحات سے روشناس کرایا تھا جن کی وجہ سے انہیں پیغمبرِ انقلاب کہا جاتا ہے۔ اور مؤرخین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی میں اتنی کم مدت میں اتنے مکمل انقلاب کی اور کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

وہ جاہلی اقدار جن کا نبی اکرمؐ نے خاتمہ فرمایا

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا تھا کہ کل امر الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی کہ آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جناب نبی اکرمؐ نے جاہلی معاشرہ کی اقدار کو پاؤں کے نیچے روند کر ایک پاکیزہ اور مثالی سوسائٹی کی طرف نسلِ انسانی کو گامزن کر دیا تھا۔

آئیے اس بات کا ہم تھوڑا سا جائزہ لے لیں کہ وہ کون سی اقدار تھیں جنہیں نبی اکرمؐ نے جاہلیت کی قدریں قرار دے کر ختم کیا تھا اور پھر یہ بھی دیکھ لیں کہ کیا وہ جاہلی قدریں پھر سے انسانی سوسائٹی کا حصہ تو نہیں بن گئیں؟ اس کا ایک سرسری سا منظر یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے:

- کفر و شرک اور بت پرستی کو جزیرۃ العرب میں اپنے دور میں مکمل طور پر ختم کر دیا تھا۔
- عریانی اس حد تک عام تھی کہ بہت سے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کا طواف بھی عریاں حالت میں کرتے تھے۔ مگر نبی اکرمؐ نے عریانی اور فحاشی کو ختم کر کے نہ صرف بیت اللہ کے عریاں

حالت میں طواف پر پابندی لگا دی تھی بلکہ عام معاشرتی زندگی میں بھی ستر اور حجاب کے احکام لاگو کر دیے تھے۔

- جُوا سرِ عام کھیلا جاتا تھا حتیٰ کہ حرم پاک کی حدود میں اور عبادت کی بعض صورتوں میں بھی جوئے کا رواج تھا جسے نبی کریمؐ نے ممنوع قرار دے دیا۔
- سود کا لین دین عام تھا، تجارت اور قرض دونوں میں سود کا کاروبار چلتا تھا مگر نبی اکرمؐ نے سود کا خاتمہ کر کے سودی کاروبار کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے مترادف قرار دے دیا۔
- شراب نوشی پر فخر کیا جاتا تھا اور شراب لوگوں کی گھٹی میں شامل سمجھی جاتی تھی مگر نبی اکرمؐ نے اس کی مکمل ممانعت فرما دی اور عملی طور پر معاشرے کو شراب سے پاک کر دیا۔
- نسل، زبان، علاقہ اور قومیت کا تفاخر اس معاشرہ کا امتیاز تھا۔ اس بنیاد پر ایک دوسرے پر برتری جتائی جاتی تھی اور ایک دوسرے پر غلبہ اور تسلط قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ نبی اکرمؐ نے انہیں جاہلی عصبیت کی علامات قرار دے کر ختم کیا اور اعلان کیا کہ شرافت اور برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہوگی۔
- بیٹی کو عار اور بوجھ سمجھا جاتا تھا، اس کا زندہ رہنے کا حق باپ کے رحم و کرم پر ہوتا تھا اور اس دور میں ہزاروں بیٹیاں صرف اس وجہ سے زندہ دفن کر دی گئیں۔ مگر نبی اکرمؐ نے بیٹی کو نہ صرف زندہ رہنے کا حق دیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دے کر عزت و توقیر بخشی۔
- ناچ گانا عام تھا۔ نبی اکرمؐ نے اسے ممنوع قرار دیا بلکہ اپنی بعثت کے مقاصد میں یہ فرما کر اس بات کو شامل کیا کہ مجھے ناچ گانے کے آلات توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔
- حلال و حرام کا کوئی فرق نہیں تھا۔ لوگوں نے اپنے اپنے ضابطے بنا رکھے تھے اور دوسروں کا مال ہضم کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراش لیے تھے۔ نبی اکرمؐ نے کھانے پینے، لین دین اور دیگر معاملات میں حلال و حرام کے مکمل ضابطے دیے اور فرمایا کہ حرام کھانے والے اور حرام طریقہ سے دوسروں کا مال کھانے والے جہنم کا ایندھن بنیں گے۔
- یتیم بچے اور عورت بطور خاص معاشرہ میں مظلومیت کا شکار تھے، ان کے حقوق کا کوئی تصور

نہیں تھا اور بالادست افراد ان پر کسی قسم کا ظلم روا رکھنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے ان دونوں طبقوں کو معاشرتی ظلم اور ناانصافی سے نجات دلائی اور ان کے حقوق کا تعین کیا۔

انسانی تاریخ کا کامیاب ترین انقلاب

یہ ان وسیع تر معاشرتی اصلاحات میں سے چند باتیں ہیں جو جناب رسول اللہؐ نے ۲۳ سالہ محنت کے ساتھ معاشرہ میں لاگو کی تھیں۔ اور یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ کا بپا کردہ انقلاب انسانی تاریخ کا کامیاب ترین انقلاب تھا۔ مگر بدقسمتی سے ان میں سے بہت سی جاہلی قدریں آج پھر انسانی معاشرے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ معاشرہ کو ان سے نجات دلانے کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہم بھی محنت کریں۔

حکمتِ عملی کا جہاد

(جنوری ۲۰۱۶ء کے دوران پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام آسٹریلیا مسجد لاہور میں منعقدہ سیرت کانفرنس میں "منافقین کے خلاف جہاد کی نبویؐ حکمتِ عملی" کے موضوع پر خطاب۔ روزنامہ اسلام لاہور، ۱۲ جنوری ۲۰۱۶ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے حوالہ سے ایک پہلو پر آج چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا، قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے جناب نبی اکرمؐ کو حکم دیا یآ ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم (التحریم ۹) کہ اے نبیؐ! کافروں اور منافقین کے ساتھ جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔ چنانچہ آپؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے دس سالہ دور میں کافروں کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔

طبقاتِ ابن سعدؒ کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ کے غزوات کی تعداد ستائیس ۲۷ ہے جو دس سال کے اندر ہوئے اور سارے جہاد کفار کے خلاف تھے۔ جبکہ یہ بات غور طلب ہے کہ منافقین کے خلاف کون سا جہاد ہوا؟ اس لیے کہ دس سالہ مدنی دور میں منافقوں کے خلاف ایک بار بھی ہتھیار نہیں اٹھایا گیا، وہ مدینہ منورہ میں رہے اور سارے معاملات میں شریک رہے، شرارتیں بھی کرتے رہے اور بڑے بڑے فتنے انہوں نے کھڑے کئے مگر ایک بار بھی ان کے خلاف تلوار استعمال نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ سے بعض سرکردہ منافقوں کو قتل کرنے کی اجازت مانگی گئی مگر جناب سرور کائناتؐ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

منافقین کی سازشیں

منافقوں نے اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف جو بڑی بڑی حرکتیں اور شرارتیں کیں ان میں سے چند کا ذکر کروں گا:

- غزوۂ احد کے موقع پر حضورؐ ایک ہزار کا لشکر لے کر احد کے دامن میں آئے تھے جن میں

سے تین سو افراد رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی کی سربراہی میں میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے، یہ صریح غداری تھی اور وفاداری سے انحراف تھا۔ بعد میں وہ میدانِ اُحد میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات پر طعنے بھی دیتے رہے جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ غزوۂ احد سے فارغ ہونے کے بعد خود مسلمانوں میں سے ایک گروہ نے اس بات کی تحریک کی کہ میدان احد سے واپس آجانے والے ان منافقوں کے خلاف جنگ لڑنی چاہیے اور جب اس پر باہمی اختلاف رائے ہو گیا تو قرآن کریم نے یہ فرما کر اس جنگ سے روک دیا کہ فما لکم فی المنافقین فئتین (النساء ۸۸) کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں کیوں بٹ گئے ہو؟ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حرکات کا قرآن میں تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا، ان کی مذمت بھی کی مگر مسلمانوں کو ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔

- ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر قذف و تہمت کے حوالے سے عبداللہ بن اُبی اور دیگر منافقین کا طرزِ عمل سب کے سامنے ہے، انہوں نے ایک ماہ تک مدینہ منورہ میں فتنہ بپا کیے رکھا۔ خود جناب رسول اللہؐ وحی آنے تک پریشانی کا شکار رہے، مسجد نبویؐ میں اس مسئلہ پر صحابہ کرامؓ میں جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ قرآن کریم میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کی مذمت کی مگر ان کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت سعد بن معاذؓ نے کھلے اجتماع میں عبداللہ بن اُبی کو قتل کر دینے کی بات کی مگر اس کی اجازت نہیں دی گئی۔
- ایک موقع پر عبداللہ بن اُبی اور اس کے چند ساتھیوں نے سفر کے دوران مہاجرین کے خلاف باتیں کیں اور یہاں تک کہہ دیا کہ اب مدینہ منورہ واپس پہنچنے پر لیخرجن الاعز منھا الاذل (المنافقون ۸) کہ ہم میں سے جو طاقت ور ہو گا وہ دوسروں کو مدینہ منورہ سے نکال دے گا۔ حضرت زید بن ارقمؓ یہ باتیں سن رہے تھے، انہوں نے حضورؐ کو بتایا تو طلب کرنے پر منافقین نے آپؐ کے سامنے اتنی قسمیں کھائیں کہ آقائے نامدارؐ نے حضرت زید بن ارقمؓ کو ڈانٹ دیا اور ان کی رپورٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر قرآن کریم میں سورۃ

المنافقون نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ منافقوں کی قسمیں جھوٹی ہیں اور زید بن ارقمؓ نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔

یہ چند شرارتیں ہیں جو میں نے ذکر کی ہیں جبکہ مدینہ منورہ میں منافقوں نے شرارتوں اور فتنوں کا ماحول مسلسل قائم رکھا۔

- حتیٰ کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر ایک جگہ چودہ منافقین گھات لگائے کھڑے تھے جنہوں نے جناب رسول اللہؐ کے وہاں سے گزرنے پر ان کو شہید کرنے کے ارادے سے گھیر لیا، انہوں نے اپنے منہ لپیٹ رکھے تھے۔ وہ اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکے مگر حضورؐ نے ان سب کو پہچان لیا۔ وہ سب کے سب مدینہ منورہ میں رہنے والے منافقین تھے، ان کے نام آپؐ نے اپنے ساتھی حضرت حذیفہؓ کو اس شرط کے ساتھ بتا دیے کہ وہ کسی اور کو اس سے آگاہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے ان ناموں کو مرتے دم تک راز میں رکھا جس کی وجہ سے وہ صاحبِ سرِ رسول اللہ یعنی رسول اللہؐ کے رازدار کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

اس قسم کی حرکتوں پر بعض منافقوں بالخصوص عبداللہ بن اُبی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی گئی اور اجازت مانگنے والوں میں حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ بھی شامل ہیں، مگر آنحضرتؐ نے اجازت دینے سے انکار فرما دیا۔ اور اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اس طرح لوگ یہ کہیں گے کہ محمدؐ نے اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔

حکمتِ عملی کا جہاد

ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن کریم میں منافقوں کے خلاف جہاد کرنے کے صریح حکم کے باوجود عملی صورتحال یہ رہی کہ حضورؐ نے نہ ان کے خلاف تلوار اٹھائی اور نہ ہی ان میں سے کسی کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ حتیٰ کہ آپؐ کو شہید کرنے کیلئے گھیر لینے والے چودہ منافقوں کے ناموں کو بھی خفیہ رکھا جن کا حضرت حذیفہؓ کے سوا کسی کو پتہ نہیں چل سکا، یہ وہ کلمہ گو کافر ہیں جنہیں خود قرآن کریم نے کافر قرار دیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں تو اس کی بنیاد کسی استدلال واستنباط پر ہوتی

ہے جس میں خطا کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے۔ لیکن ان کلمہ گو منافقوں کو قرآن کریم نے وماھم بمؤمنین اور انھم لکاذبون کہہ کر کافر قرار دیا مگر انہیں قتل کرنے اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی اس لیے کہ وہ کافر ہونے کے باوجود ''کلمہ گو'' تھے۔

سوال یہ ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ان کلمہ گو کافروں کے خلاف جنگ نہیں لڑی اور ان میں سے کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی تو منافقوں کے خلاف جہاد کرنے اور ان پر سختی کرنے کے اس حکم کا کیا ہوا جو قرآن کریم میں آج بھی موجود ہے؟ کیا یہ سوچا بھی جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے اس قرآنی حکم پر عمل نہیں کیا؟ ایسا نہیں ہے بلکہ رسول اکرمؐ نے اس حکم پر پورا عمل کیا، منافقوں کے خلاف جہاد کیا، لیکن وہ جہاد تلوار کا نہیں بلکہ حکمتِ عملی کا تھا جس کے نتیجے میں حضورؐ کے دور میں ہی یہ منافقین ختم ہو گئے تھے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان منافقوں کا تاریخ میں کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

یہ حکمت عملی کا جہاد کیا تھا اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے تعارف کا لحاظ

اس سلسلہ میں پہلی بات تو وہی ہے جو میں نے ذکر کی ہے کہ جناب نبی اکرمؐ دنیا کو یہ تاثر اور پیغام نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں اس لیے کہ اس سے اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچتا ہے اور باقی دنیا کے سامنے مسلمانوں کا تعارف صحیح نہیں رہتا۔

داخلی گروہ بندی اور علیحدہ تشخص سے بچاؤ

دوسری بات یہ ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ منافقین کا یہ گروہ مدینہ منورہ میں اپنا الگ تشخص قائم نہ کر سکے، اس کا امکان سب سے پہلے غزوۂ اُحد کے موقع پر پیدا ہوا تھا جب منافقین تین سو کی تعداد میں الگ ہو گئے تھے۔ ایک ہزار میں سے تین سو کا الگ ہو جانا ان کی طرف سے قوت کا اظہار تھا اور اپنے الگ تشخص کی علامت بھی تھی۔ اگر اس موقع پر ان کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے جاتے تو مدینہ منورہ کے اندر ایک مستقل محاذ قائم ہو جاتا اور مسلم سوسائٹی لوگوں کی نظروں میں دو حصوں میں بٹ جاتی۔ آنحضرتؐ نے اس صورتحال سے بچنے کیلئے ان کی اتنی بڑی حرکت کو نظر انداز کر

دیا اور ان کے خلاف کوئی عملی کاروائی نہیں کی گویا ان کے اس وار کو حکمتِ عملی سے ناکام بنادیا۔

دوسرا موقع ''مسجد ضرار'' کی تعمیر کا تھا۔ یہ بھی منافقین کی طرف سے اپنے الگ تشخص کے اظہار کی کوشش تھی جسے قرآن کریم نے کفرًا و تفریقًا بین المؤمنین وارصادًا لمن حارب اللّٰہ ورسولہ (التوبہ ۱۰۷) سے تعبیر کیا ہے۔ حضورؐ نے کمال حکمتِ عملی سے یہ مسجد تو ختم کر دی مگر ان منافقین کے خلاف کوئی ایکشن نہ لے کر ان کے الگ تشخص اور گروہ بندی کے امکانات بھی ناکام بنادیے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد جس طرح تلوار سے ہوتا ہے اسی طرح حکمتِ عملی سے بھی ہوتا ہے۔ جہاں تلوار کی ضرورت ہے وہاں ہتھیار اٹھانا جہاد ہے اور جہاں حکمتِ عملی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں حکمت و دانش سے کام لینا اور ہتھیار نہ اٹھانا بھی جہاد ہی کہلاتا ہے۔ آج کے دور میں اور دنیا کے موجودہ حالات میں اس حکمتِ نبویؐ کو سمجھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

معاہدۂ حدیبیہ کے اہم سبق

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ فروری ۲۰۱۶ء)

آج کے حالات کے تناظر میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ کا ایک اہم پہلو ذکر کیا جا رہا ہے جو یقیناً ہمارے لیے راہنمائی کا باعث ہے، خدا کرے کہ ہم اس سے صحیح طور پر استفادہ کر سکیں۔

معاہدہ کی بے لچک پاسداری

صلحِ حدیبیہ کے معاہدہ میں جہاں یہ طے ہوا تھا کہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان دس سال تک جنگ نہیں ہوگی، وہاں دوسری شرائط کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ مکرمہ سے قریش کا کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرے گا تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا (نعوذ باللہ) ساتھ چھوڑ کر مکہ مکرمہ چلا جائے گا تو اس کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔

اس شرط پر مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ یہ برابری کی شرط نہیں تھی اور معاہدات کی روح کے خلاف تھی۔ حضرت عمرؓ نے تو اس اضطراب کا کھلم کھلا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن حضورؐ نے نہ صرف اس شرط کو منظور کر لیا بلکہ اس موقع پر قریش کی طرف سے مذاکرات کرنے والے نمائندہ سہیل بن عمرو کا اپنا بیٹا ابو جندلؓ زنجیروں میں جکڑا ہوا مسلمانوں کے ساتھ جانے کے لیے کسی طرح حدیبیہ تک آ پہنچا تو سہیل بن عمرو کے مطالبہ پر آنحضرتؐ نے اسے اسی طرح پابجولاں اس کے والد کے ساتھ مکہ مکرمہ واپس بھجوا دیا۔ جبکہ حضرت عمرؓ اور دیگر مسلمانوں کی اس حوالہ سے بے چینی اور اضطراب میں انہیں تسلی دیتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ فرمایا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں، اس لیے اسی میں خیر ہوگی۔

معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں سے براءت

اس معاہدہ کو تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ ایک قریشی نوجوان ابو بصیرؓ مسلمان ہو کر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچ گئے جس پر مکہ والوں نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور دو آدمی انہیں واپس لانے کے لیے بھجوائے۔ آنحضرتؐ نے معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے ابو بصیرؓ کو ان دو نمائندوں کے ہمراہ واپس بھجوا دیا۔ راستہ میں ایک جگہ ابو بصیرؓ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہی میں سے ایک کی تلوار لے کر اسے قتل کر دیا اور مدینہ منورہ واپس آکر حضورؐ سے کہا کہ آپ نے تو معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے، اب میں ان سے جان چھڑا کر واپس آگیا ہوں۔ اس پر نبی کریمؐ نے شدید ردعمل کا اظہار فرمایا اور اس کے بارے میں کہا کہ ویل لأمه مسعر حرب اس کی ماں کے لیے ہلاکت ہو یہ لڑائی کی آگ بھڑکائے گا۔ اتنے میں راستہ میں ابو بصیرؓ کے وار سے بچ جانے والا دوسرا شخص بھی بھاگ کر مدینہ منورہ آگیا اور حضورؐ کو سارا ماجرا سنا دیا۔

جب حضرت ابو بصیرؓ نے اپنی کاروائی پر حضورؐ کا سخت ردعمل دیکھا تو چپکے سے وہاں سے نکل گئے اور مکہ مکرمہ واپس جانے کی بجائے راستہ میں سیف البحر کے مقام پر ڈیرہ لگا لیا۔ یہ مکہ مکرمہ سے شام جانے والے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ میں تھا۔ چند دنوں کے بعد حضرت ابو جندلؓ بھی کسی طرح جان بچا کر ان کے پاس وہاں آ گئے جنہیں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ پابجولاں واپس کر دیا تھا۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ مکہ مکرمہ کے علاقہ سے جو شخص بھی مسلمان ہوتا وہ مدینہ منورہ جانے کی بجائے حضرت ابو بصیرؓ کے کیمپ میں پہنچ جاتا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد ستر تک پہنچ گئی، جبکہ بعض روایات میں تین سو کی تعداد بھی مذکور ہے۔ انہوں نے قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنا اور ان کا سامان چھیننا شروع کر دیا اور کچھ افراد ان کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے۔ اس پر قریش میں تشویش پیدا ہوئی مگر وہ جناب نبی اکرمؐ سے شکایت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اس لیے کہ حضورؐ نے ان میں سے کسی شخص کو قبول نہیں کیا تھا، بلکہ مدینہ منورہ پہنچنے والوں کو واپس کر دیا تھا اور ڈانٹ بھی پلائی تھی۔ یہ کیمپ آزاد علاقہ میں تھا جس کی ذمہ داری آنحضرتؐ پر عائد نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی ان لوگوں سے نمٹنا قریش کے بس میں رہا تھا۔

فریقِ مخالف کی طرف سے معاہدہ کی شق سے دستبرداری کی قبولیت

چنانچہ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ اس ساری صورتحال کی اصل وجہ معاہدۂ حدیبیہ کی وہ شرط ہے جو یکطرفہ تھی اور جس کے نتیجے میں یہ حالات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس لیے قریش نے جناب نبی اکرمؐ کے پاس وفد بھجوا کر پیشکش کی کہ اگر یہ کیمپ ختم ہو جائے تو وہ معاہدہ کی اس شق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اس پر حضورؐ نے قریش کی پیشکش قبول کر کے حضرت ابوبصیرؓ کو خط بھجوایا کہ انہیں معاہدۂ حدیبیہ کی جس شق کی وجہ سے پریشانی تھی وہ ختم ہوگئی ہے اس لیے وہ احتجاجی کیمپ ختم کر کے مدینہ منورہ آجائیں، انہیں قبول کر لیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں جناب رسول اللہؐ نے کیمپ ختم کر کے واپس آنے والوں کے لیے "عام معافی" کا اعلان کر دیا تھا۔

معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے واپسی کا راستہ

تاریخی روایات میں ہے کہ آنحضرتؐ کا یہ گرامی نامہ حضرت ابوبصیرؓ کو پہنچا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر کے انہیں سنایا، لیکن ابھی وہ خط پڑھ ہی رہے تھے کہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہوگیا اور وہ اس کیفیت میں فوت ہوئے کہ نبی کریمؐ کا نامۂ مبارک ان کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت ابوجندلؓ ان کے جنازہ اور تدفین کے بعد حضورؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مدینہ منورہ آگئے اور دوسرے سب ساتھی بھی کیمپ ختم کر کے اپنی اپنی محفوظ جگہوں پر چلے گئے۔ جناب نبی کریمؐ نے ان سب کو مسلمان سوسائٹی کے حصہ کے طور پر قبول فرمایا اور کسی کو دوبارہ سرزنش نہیں کی۔ جبکہ حضرت ابوجندلؓ خلافتِ راشدہ کے دور میں ایک جہاد کے دوران شہید ہوئے۔

سیرۃ النبیؐ کے اس اہم واقعہ اور اسوۂ نبویؐ کے اس اہم پہلو سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

- آنحضرتؐ نے قریش کے ساتھ معاہدہ کی مکمل پاسداری کی اور اس میں کوئی لچک نہیں دکھائی۔
- معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں اور ان کے کسی عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا، ڈانٹ پلائی اور لاتعلقی کا اظہار کیا۔

- معاہدہ کی ناجائز اور یکطرفہ شق کا فریقِ مخالف میں احساس پیدا ہونے پر ان کی طرف سے اس شق سے دستبرداری کو قبول فرمایا۔
- خراب ہو جانے والے حالات کو صحیح سمت لے جانے کے لیے ان کے اسباب و عوامل کو بھی سامنے رکھا گیا اور ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔
- کیمپ ختم کر کے مدینہ منورہ یا اپنے اپنے محفوظ ٹھکانوں پر چلے جانے والوں کو واپسی کا راستہ دیا گیا اور ان سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔

اس قسم کے حالات میں اسوۂ نبوی میں ہمارے لیے یہ راہنمائی موجود ہے، لیکن کیا ہمارے پالیسی ساز اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے؟

دفاعِ وطن اور اسوۂ نبوی ﷺ (۱)

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ ستمبر ۲۰۱۶ء)

۶ ستمبر کو ملک بھر میں ''یومِ دفاع پاکستان'' منایا جا رہا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں اس روز انڈیا کی فوجوں نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا جس کا مسلح افواج اور پوری قوم نے متحد ہو کر منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اُن دنوں قومی جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ میری عمر اس وقت سترہ سال تھی، میں جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں درسِ نظامی کا طالب علم تھا اور اس جنگ میں سول ڈیفنس کے رضا کار کے طور پر عملاً شریک ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں روزنامہ وفاق لاہور کے نامہ نگار کی حیثیت سے جنگ کے مختلف واقعات کی رپورٹنگ بھی کی تھی۔ محکمہ شہری دفاع میں علماء کا ایک مستقل ونگ ہوتا تھا جس کے چیف وارڈن اس وقت ملک کے معروف خطیب مولانا عبد الرحمن جامیؒ تھے جبکہ میں ایک رضا کار کے طور پر اس کا حصہ تھا۔

آج یومِ دفاعِ پاکستان کے حوالہ سے کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا تو ذہن میں خیال آیا کہ ''دفاعِ وطن'' کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کی کچھ جھلکیاں قارئین کے سامنے پیش کر دی جائیں تاکہ اس سے برکت کے ساتھ ساتھ راہنمائی بھی ملے اور نسبت بھی تازہ ہو جائے۔

نبی اکرمؐ کے غزوات

نامور مؤرخ و محدث امام ابن سعدؒ کی تحقیق کے مطابق جناب رسول اللہؐ نے مدینہ منورہ کی دس سالہ زندگی میں ستائیس کے لگ بھگ غزوات میں خود شرکت فرمائی۔ ان میں اقدامی جنگیں بھی تھیں اور دفاعی جنگیں بھی شامل تھیں، مثلاً (۱) بدر (۲) خیبر (۳) بنو مصطلق اور (۴) فتح مکہ کی جنگیں اقدامی تھیں کہ آنحضرتؐ ان جنگوں میں دشمن پر خود حملہ آور ہوئے تھے۔ جبکہ (۱) اُحد (۲) احزاب اور (۳) تبوک کی جنگیں دفاعی تھیں کہ حملہ آور دشمنوں سے مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے حضورؐ میدان جنگ

میں آئے تھے اور دشمنوں کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی تھی۔

جنگی حکمتِ عملی اور رائے عامہ کا اعتماد

اُحد کی جنگ میں قریش کا لشکر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہا تھا جس پر آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ شہر کے اندر محصور ہو کر دفاع کرنا چاہیے یا شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرنا چاہیے؟ خود حضورؐ کی رائے شہر میں محصور ہو جانے کی تھی مگر اکثریت کا رجحان کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اکثریتی رائے کو قبول کرتے ہوئے شہر سے باہر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا مگر زیادہ دور نہیں گئے بلکہ اس وقت کے مدینہ منورہ کی آبادی سے تین میل کے فاصلے پر اُحد کے میدان میں دشمن سے نبرد آزما ہوئے۔ اس میں ایک سبق یہ بھی ہے کہ ملکی دفاع میں رائے عامہ کو اعتماد میں لینا اور قوم کو مشاورت میں شریک کرنا بھی سنت نبویؐ ہے۔

غزوۂ احزاب میں جناب نبی اکرمؐ نے شہر میں محصور ہو کر قریش اور ان کے اتحادیوں کی مشترکہ فوجوں کا راستہ روکا۔ شہر میں ان کے داخلہ کو روکنے کے لیے آبادی کے اردگرد گہری خندقیں کھدوائیں جس کی وجہ سے دشمن افواج کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود مدینہ میں داخل نہ ہو سکیں اور کم و بیش ایک ماہ کا ناکام محاصرہ کرنے کے بعد نامراد واپس لوٹ گئیں۔

تبوک کا غزوہ بھی رومی افواج کی مدینہ منورہ کی طرف یلغار کی مسلسل خبروں کے باعث منظم کیا گیا تھا۔ حضورؐ مسلمانوں کے بھاری لشکر کے ساتھ روم کے زیر نگیں صوبہ شام کی طرف بڑھے مگر شام کی سرحد پر تبوک سے آگے بڑھنے کی بجائے وہیں رک کر رومی فوجوں کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب واضح ہو گیا کہ رومی فوجیں پیش قدمی کا حوصلہ نہیں کر رہیں تو تقریباً ایک ماہ تک وہاں انتظار کرنے کے بعد آپؐ نے مدینہ منورہ کی طرف واپسی کا سفر کیا۔

دفاعی نقطۂ نظر سے آبادیوں کی اہمیت

مدینہ منورہ جناب نبی اکرمؐ کی تشریف آوری کے بعد ایک باقاعدہ ریاست کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس کے حاکم اعلیٰ خود جناب رسول اللہؐ تھے۔ اس ریاست کو ہر وقت کسی نہ کسی دشمن کے حملہ کا خطرہ درپیش رہتا تھا اور اس کے مقابلہ کے لیے حضورؐ خود بھی تیار رہتے تھے اور ساتھیوں کو بھی چوکنا

رہنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ جناب نبی اکرمؐ کی دفاعی حکمتِ عملی کی ایک جھلک یہ ہے کہ انصارِ مدینہ کا قبیلہ "بنو سلمہ" "مسجد نبویؐ کے راستے میں ایک فاصلے پر آباد تھا۔ ایک موقع پر انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے مکانات فروخت کر کے مسجد نبویؐ کے قریب جگہ خرید کر مکان بنالیں تاکہ مسجد کے قریب ہو جائیں اور آپؐ کی صحبت سے فیضیاب ہو سکیں۔ لیکن آنحضرتؐ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بنو سلمہ اگر اپنے مکانات بیچ کر مسجد نبویؐ کے قریب منتقل ہو جاتے تو وہ راستہ اور علاقہ مسلمانوں کے وجود سے خالی ہو جاتا جو کہ دفاعی نقطۂ نظر سے مناسب نہیں تھا، اس لیے حضورؐ نے دفاعی حکمتِ عملی کے تحت بنو سلمہ کو وہ علاقہ خالی کرنے سے منع فرمایا۔

دشمن سے چوکنا رہنے کی ضرورت

دفاعی سرگرمیوں میں صحابہ کرامؓ کو ہوشیار رکھنے کے ساتھ ساتھ آپؐ خود بھی عملی طور پر ان میں پیش پیش رہتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ایک مرحلہ میں مدینہ منورہ پر بیرونی حملہ آوروں کی دراندازی کا خطرہ بڑھ گیا تھا اور لوگوں کو خدشہ رہتا تھا کہ دشمن کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس دوران ایک رات نصف شب کے لگ بھگ ایک طرف سے شور کی آواز آئی تو بہت سے لوگ بیدار ہو کر صورتحال معلوم کرنے کے لیے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ مگر یہ لوگ ابھی مدینہ کی آبادی سے باہر نکل رہے تھے کہ سامنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس آتے دکھائی دیے جو گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار مدینہ میں یہ اعلان کرتے ہوئے داخل ہو رہے تھے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، میں چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھ آیا ہوں اس وقت خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دشمن کے حملہ کے ہر وقت خطرہ کے ماحول میں آدھی رات کو اکیلے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر آبادی کے چاروں طرف چکر لگانا اور واپس آکر ساتھیوں کو تسلی دینا آنحضرتؐ ہی کا حوصلہ تھا جو دفاعِ وطن کے لیے آپؐ کے جذبات اور طرزِ عمل کی صرف ایک جھلک ہے۔

آج وطنِ عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان کو دفاعی حوالہ سے جن خطرات کا سامنا ہے ان کے سدباب کے لیے جناب نبی اکرمؐ کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ سے مسلسل راہنمائی کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دفاعِ وطن اور اسوۂ نبوی ﷺ (۲)

(۱۳اکتوبر ۲۰۱۶ء کو جامع مسجد چک ۱۱، بھلوال میں خطاب۔ روزنامہ اسلام لاہور، ۱۶اکتوبر ۲۰۱۶ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مولانا مفتی شاہد مسعود نے آج کی تقریب کے ایک پہلو پر بہت اچھی گفتگو کی ہے کہ ایک دینی مدرسہ کا آغاز ہو رہا ہے جس میں قرآن وسنت و دیگر دینی علوم کی تعلیم سے علاقہ کے عوام کو بہت فوائد حاصل ہوں گے۔ جبکہ میں دوسرے پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ مدرسہ ایک شہید کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر وطنِ عزیز کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا اور اس کے خاندان نے اپنے شہید سپوت کی یاد کو تازہ رکھنے کا بہت خوبصورت اہتمام کیا ہے۔ آج کل پاک بھارت سرحد پر کشیدگی کا ماحول پھر سے دکھائی دے رہا ہے اس لیے میں اس موقع پر وطن کے دفاع کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کی چند جھلکیاں آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مشترکہ دفاع کا معاہدہ

جناب رسول اللہؐ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور ایک ریاست کا ماحول بنا تو آنحضرتؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مدینہ منورہ اور اردگرد کے سب قبائل کو جمع کر کے مشترکہ حکومتی نظام کے ساتھ ساتھ مشترکہ دفاع کے معاہدہ کا اہتمام فرمایا۔ ''میثاقِ مدینہ'' میں سب نے مل کر طے کیا کہ مدینہ منورہ پر حملہ کی صورت میں اس کے دفاع کی ذمہ داری سب پر ہوگی اور مسلمان و کافر مل کر اس وطن کا تحفظ کریں گے۔ اس طرح آپؐ نے یہ اصول دیا کہ وطن کا دفاع سب اہلِ وطن کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔

اس کے بعد دس سال کے دوران جناب نبی اکرمؐ نے دو درجن سے زائد جنگیں لڑیں جن میں صرف دو ایسی تھیں جن میں مدینہ پر حملہ کیا گیا تھا اور وہ مدینہ منورہ کے ماحول میں لڑی گئی تھیں۔ ایک اُحد کی جنگ اور دوسری احزاب کی جنگ تھی جن میں مدینہ منورہ دشمن کی یلغار کا نشانہ بنا تھا اور ان

جنگوں میں دشمن کے ساتھ یہودیوں کی ساز باز کو ''میثاقِ مدینہ'' کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے اس کا ایکشن لیا گیا تھا۔

اُحد کی جنگ کے حوالے سے دو باتوں کا بطور خاص ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

رائے عامہ کا اعتماد

پہلی بات کہ نبی اکرمؐ نے جنگ کے میدان میں جانے سے قبل مسلم سوسائٹی کو اعتماد میں لیا تھا اور سب کے مشورہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے باہر جا کر جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن مدینہ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے بلکہ آبادی سے باہر اس کے ساتھ ہی اُحد پہاڑ کے دامن کو میدان جنگ بنایا تھا جو کہ مشورہ میں پیش کی جانے والی دو مختلف تجویزوں کو جمع کرنے کی ایک صورت تھی۔

ناساز حالات میں نیا محاذ کھولنے سے گریز

اور دوسری بات یہ کہ آنحضرتؐ ایک ہزار کا لشکر لے کر اُحد کے میدان میں گئے تھے جن میں سے تین سو افراد ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے تھے جو عین حالتِ جنگ میں سنگین جرم اور غداری کے مترادف تھا۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ تجویز سامنے آئی کہ ان سے بھی جنگ کی جائے مگر حضورؐ نے اس موقع پر داخلی محاذ کھولنے سے گریز کیا اور کسی قسم کا کوئی ایکشن نہ لے کر مدینہ منورہ کے اندرونی ماحول کو خلفشار سے بچا لیا۔ جبکہ قرآن کریم نے بھی فمالکم فی المنافقین فئتین (النساء ۸۸) والی آیات میں حضورؐ کی اس حکمتِ عملی کی حمایت کر دی۔ یہ جناب رسول اللہؐ کی حکمت و تدبر کا شاہکار تھا کہ بیرونی جنگ کے ساتھ ساتھ اندرونی جنگ کا ماحول قائم نہ ہونے دیا اور داخلی وحدت کی ہر ممکن حفاظت فرمائی۔

کامیاب تجربات سے استفادہ

مدینہ منورہ پر دوسرا حملہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا جس کے جواب میں حضورؐ نے جنگ کے روایتی طریقوں سے ہٹ کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا جو فارسیوں کا طریقہ تھا کہ شہر کے دفاع کے لیے ارد گرد خندق کھودی جائے۔ اس سے آنحضرتؐ کی یہ سنت اور ذوق سامنے آیا کہ جنگ کے لیے جو

طریقہ بھی وقت کی ضرورت ہو اسے اختیار کیا جائے اور دنیا کے تجربات سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

میدانِ جنگ کے خودکش حملے

اس کے ساتھ ایک بات شہید اعجاز حسین کے حوالہ سے کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چونڈہ کی جنگ میں جامِ شہادت نوش کیا تھا جب انڈیا نے سینکڑوں ٹینکوں کے ذریعے خوفناک یلغار کی تھی۔ ظاہری طور پر ٹینکوں کی اتنی بڑی یلغار کا راستہ روکنا ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر پاک فوج کے بہادر جوان اپنے سینوں پر بم باندھ کر ان ٹینکوں کے نیچے گھس گئے اور اپنی قیمتی جانوں کی قربانیاں دے کر اس یلغار کو ناکام بنا دیا۔ اس موقع پر یہ سوال اٹھا تھا کہ کیا یہ خودکشی نہیں ہے؟ اس کا جواب علماء کی طرف سے دیا گیا تھا کہ اس قسم کے خودکش حملے بسا اوقات جنگ کی ناگزیر ضرورت بن جاتے ہیں اس لیے یہ بھی جنگ کا ہتھیار ہیں جو میدانِ جنگ میں ہوں تو جائز اور ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ میدان جنگ سے ہٹ کر کسی اور مقصد کے لیے اور پر امن ماحول میں اس قسم کی کاروائیاں بلاشبہ حرام ہیں اور ان کا کوئی جواز نہیں ہے۔

آج وطنِ عزیز کو پھر جنگ کی صورتحال کا سامنا ہے اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا کے ساتھ ساتھ اس کے لیے ہر وقت تیار بھی رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ وطنِ عزیز کی حفاظت فرمائیں اور پوری قوم کو وحدت اور عزم کے ساتھ اس صورتحال کا سامنا کرنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

کفار کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا معاشرتی رویہ

(۲۵ اکتوبر ۲۰۱۶ء کو مجلس احرار اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں
ایک تربیتی نشست سے خطاب۔ مطبوعہ ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، نومبر ۲۰۱۶ء)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کے اس پہلو پر آج کی محفل میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کافروں کے ساتھ معاشرتی زندگی میں کیا معاملہ کیا ہے اور ان کے ساتھ زندگی کیسے گزاری ہے؟ اس حوالہ سے جناب سرورِ کائناتؐ کی حیاتِ مبارکہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

نبوت سے پہلے کا مکی دور

پہلا حصہ اس چالیس سالہ دور کا ہے جو نبوت سے پہلے مکہ مکرمہ میں گزرا۔ نبی اکرمؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اس لیے کفر و شرک، بت پرستی اور جاہلانہ رسوم سے آپ کی نفرت طبعی تھی۔ حضورؐ ان امور میں معاشرے کے ساتھ شریک نہیں تھے اور ایسی تمام باتوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ لیکن عمومی معاشرت میں باقی لوگوں کے ساتھ آپؐ بھی اسی معاشرے کا حصہ تھے، سوسائٹی کے معاملات میں شریک ہوتے تھے، رشتہ داریاں قائم تھیں اور لین دین کے معاملات بھی جاری رہتے تھے۔

اعلانِ نبوت کے بعد کا مکی دور

جناب نبی اکرمؐ کی معاشرتی زندگی کا دوسرا حصہ نبوت ملنے کے بعد کا ہے۔ جب نبوت ملی اور آنحضرتؐ نے توحید کی دعوت کا آغاز کیا تو صورتحال مختلف ہوگئی۔ اس سے قبل اخلاقِ حسنہ اور خدمتِ خلق کے باعث آپؐ کو سوسائٹی کی پسندیدہ ترین شخصیت کی حیثیت حاصل تھی، صادق و امین کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور مختلف امور میں آپ سے راہنمائی لی جاتی تھی۔ لیکن توحید کے اعلان اور

عام محفلوں میں قرآن کریم کی تلاوت کو ناپسند کیا گیا اور مخالفت کا دور شروع ہو گیا جو تیرہ سال جاری رہا۔

آزمائش و ابتلا اور معاشرتی مقاطعہ

یہ تیرہ سالہ دور مخالفت کا دور تھا، آزمائش و ابتلا کا دور تھا اور اذیت و تکلیف کا دور تھا۔ اس دور میں جہاں نبی اکرمؐ نے دین کی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، اپنی جماعت کی توسیع کی محنت کرتے رہے، ساتھ دینے والے حضرات کی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور صبر و حوصلہ کے ساتھ اپنے مشن کو مسلسل آگے بڑھاتے رہے، وہاں مکہ مکرمہ کی عمومی معاشرت کا حصہ رہے اور معاشرتی معاملات میں برابر شریک ہوتے رہے۔

حتیٰ کہ ایک موقع پر قریش کے مختلف خاندانوں نے اجتماعی فیصلہ کر کے آنحضرتؐ اور ان کے ساتھیوں کا معاشرتی بائیکاٹ کر دیا جو تین سال جاری رہا، اس دوران شعبِ ابی طالب میں انہیں محصور کر دیا گیا اور بائیکاٹ کی نگرانی کیلئے ناکہ بندی کا اہتمام بھی کیا گیا لیکن یہ بائیکاٹ یکطرفہ تھا۔ جناب رسول اللہؐ نے اس دور میں بھی دعوت و تبلیغ کے تقاضوں کی تکمیل کی اور بائیکاٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے تعلقات اور دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس دور میں کافروں کا غلبہ تھا اور مسلمان اقلیت میں تھے بلکہ وہ اکثریت کے مظالم اور اذیتوں کا نشانہ تھے لیکن آنحضرتؐ نے مزاحمت کا راستہ اختیار نہیں کیا، نہ اجتماعی مزاحمت کی اور نہ ہی انفرادی طور پر کسی ساتھی کو اس کی اجازت دی۔ بلکہ حوصلہ اور صبر کے ساتھ مظالم برداشت کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ قائم رکھا۔

دعوت و تبلیغ کے ساتھ حمایت و حفاظت کی تلاش

البتہ اس دوران مکہ مکرمہ کی آبادی سے ہٹ کر مختلف اطراف سے دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ کافر قبائل میں اپنی حمایت و حفاظت کے مواقع بھی تلاش کرتے رہے۔

- طائف کا سفر جناب رسول اللہؐ نے اسی لیے کیا تھا کہ بنو ثقیف کے سرداروں کو قریش کے مظالم کے خلاف اپنی حمایت کے لیے آمادہ کر سکیں۔

- حبشہ کی طرف صحابہ کرامؓ کی ہجرت کا بھی ایک اہم مقصد مسلمانوں کیلئے محفوظ پناہ گاہ مہیا کرنا تھا، جو حاصل ہو گئی۔
- جبکہ حج کیلئے یثرب سے آنے والے قافلوں کے خیموں میں حضورؐ کا بار بار جانا اور انہیں دعوت دینا بھی اسی لیے تھا کہ وہ مسلمان ہو کر مکہ مکرمہ کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھی بنیں اور انہیں محفوظ ٹھکانہ مہیا کریں، جیسا کہ عملاً ہو بھی گیا۔ یثرب سے آنے والے لوگوں کے ساتھ بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بعد نبی اکرمؐ کی ہجرت کی راہ ہموار ہوئی اور اس ہجرت پر مکہ مکرمہ کے تیرہ سالہ مظلومانہ دور کا اختتام ہوا۔

مدینہ کا دس سالہ ہنگامہ خیز دور

اس کے بعد جناب رسول اللہؐ کی معاشرتی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جو دس سال جاری رہا اور یہ سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور تھا۔

ریاستِ مدینہ کا قیام

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضرتؐ کی ہجرت سے پہلے یثرب اور اردگرد کے قبائل ایک علاقائی حکومت کے قیام پر متفق ہو چکے تھے اور بادشاہ کے طور پر عبداللہ بن اُبی کے نام کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا، صرف تاج پوشی کی رسم باقی تھی کہ حضورؐ کی تشریف آوری سے ساری صورتحال بدل گئی۔ وہ حکومت جو عبداللہ بن اُبی کی سربراہی میں قائم ہونا تھی وہ آپؐ کی قیادت میں تشکیل پا گئی۔

میری طالب علمانہ رائے میں اس ریاست و حکومت کے خدوخال طے کرنے کیلئے قبائل کے درمیان جو مذاکرات ہو چکے تھے وہی ''میثاقِ مدینہ'' کا ہوم ورک اور اساس بنے جس میں حضورؐ نے بنیادی تبدیلی یہ کی کہ اسے ایک نظریاتی ریاست کی شکل دے دی جو آگے چل کر خلافتِ راشدہ اور عالمی اسلامی خلافت کی صورت میں دنیا میں پھیلتی چلی گئی۔ ابتدا میں اس حکومت و ریاست میں مسلمان بھی شامل تھے، یہودی قبائل بھی اس کا حصہ تھے اور اردگرد کے دیگر قبائل بھی اس میں شریک تھے جبکہ اس نظم میں آنحضرتؐ کو حاکمِ اعلیٰ جبکہ میثاقِ مدینہ کو دستور کی حیثیت حاصل تھی۔

یہودیوں کی جلاوطنی

بعد میں یہودی قبائل میثاق کی خلاف ورزی کے باعث یکے بعد دیگرے مدینہ منورہ سے جلاوطن ہوتے گئے اور بنو قریظہ کی جلاوطنی کے بعد مدینہ منورہ مسلمانوں کیلئے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہودیوں کو مدینہ منورہ سے نکالنے میں مسلمانوں نے پہل نہیں کی تھی بلکہ خود یہودیوں نے اپنی فطرت کے مطابق مسلسل بدعہدی کے ذریعے یہ ماحول پیدا کر لیا تھا، اور ان کی جلاوطنی کے فیصلے اس وقت کے عام عرف کے مطابق جرگوں اور ثالثوں کے ذریعے ہوئے اور یہودیوں نے ان فیصلوں کو تسلیم کیا۔

منافقین سے سابقہ

مدینہ منورہ میں جناب نبی اکرمؐ کو ایک اور طبقہ سے بھی سابقہ روپیش رہا جس کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر وما هم بمومنين وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ منافقین تھے جن کی قیادت عبد اللہ بن اُبی کر رہا تھا، میری طالب علمانہ رائے میں عبد اللہ بن اُبی کو حکومت کا چانس ختم ہو جانے پر جو غصہ تھا وہ باقی ساری زندگی اس کا بدلہ ہی لیتا رہا، اس نے مدینہ منورہ میں بڑے بڑے فتنے کھڑے کیے اور مسلمانوں کو پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

- اُحد کی جنگ میں وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان سے نکل گیا، اس وقت جنگ کے لیے اُحد تک جانے والے لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی جن میں سے تین سو افراد عبد اللہ بن ابی کی قیادت میں میدان چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔ اس سے ان کا تناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کم و بیش تیس فی صد تھے۔
- غزوۂ احد کے بعد مسلمانوں میں ان منافقین کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے، بعض کی رائے تھی کہ ان کے خلاف کاروائی کی جائے جبکہ دوسرے حضرات کا خیال تھا کہ انہیں اسی طرح ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کا ذکر قرآن کریم نے فمالكم فى المنافقين فئتين کی آیت کریمہ میں کیا ہے۔
- ان منافقین نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر جھوٹی تہمت کا بازار گرم کیا۔
- انہوں نے مدینہ منورہ سے مہاجرین کو نکال دینے کی سازش بھی کی جس کا تذکرہ قرآن کریم کی

سورۃ المنافقون میں ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود حضورؐ نے ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی بلکہ وہ معاشرتی زندگی حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی مسلمانوں کے ساتھ مسلسل شریک رہے۔ ان کے خلاف نہ کوئی احتجاجی کاروائی ہوئی اور نہ ہی انفرادی طور پر ان میں سے کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی کسی کو اجازت ملی۔ عبداللہ بن اُبَی کو قتل کرنے کی اجازت حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کے علاوہ حضرت سعد بن معاذؓ نے بھی مانگی تھی مگر آپؐ نے کسی کو اجازت نہیں دی اور یہ فرمایا کہ اس سے دنیا کے دوسرے لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ حضرت محمدؐ تو اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

یہ جناب نبی اکرمؐ کی کمال حکمتِ عملی تھی کہ ان منافقین کی الگ گروہی شناخت قائم نہ ہونے دی جائے اور انہیں مدینہ منورہ کے اندر کوئی داخلی محاذ بنانے کا موقع نہ دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن چودہ منافقین نے نبی اکرمؐ کو راستے میں گھیر کر قتل کرنے کی ناکام کاروائی کی تھی، آپؐ نے ان کے نام تک حضرت حذیفہؓ کے علاوہ کسی کو نہیں بتائے اور انہیں بھی سختی کے ساتھ تاکید کی کہ ان میں سے کسی کا نام ظاہر نہ ہونے پائے۔ اور یہ بھی اسی حکمتِ عملی کا حصہ تھا کہ انہیں مسجد کے نام پر اپنا الگ مرکز بنانے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ ان کی بنائی ہوئی مسجد کو ''مسجد ضرار'' قرار دے کر منہدم کرا دیا گیا۔

ان منافقین کے بارے میں جنہیں قرآن کریم نے وماہم بمؤمنین کہہ کر کافر قرار دینے کا اعلان کر دیا تھا، آنحضرتؐ کی حکمتِ عملی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں معاشرتی طور پر الگ کر کے اپنا تشخص قائم کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور داخلی طور پر اپنے لیے کوئی محاذ کھڑا نہ ہونے دیا جائے، اس کامیاب حکمتِ عملی کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ لوگ جو غزوۂ اُحد کے وقت کم و بیش تیس فیصد دکھائی دے رہے تھے، حضرت حذیفہؓ والے واقعہ تک ان کی تعداد درجن بھر رہ گئی تھی، اور اس کے بعد تاریخ میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ وہ کدھر گئے؟ ظاہر بات ہے کہ سارے مرکھپ تو نہیں گئے تھے بلکہ آہستہ آہستہ توبہ تائب ہو کر مسلمانوں کے عمومی معاشرے میں تحلیل ہو کر رہ گئے تھے جو جناب رسول اللہؐ کی کمال حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا۔

اس دس سالہ مدنی دور میں کفار کے ساتھ جناب نبی اکرمؐ کی معاشرتی حکمتِ عملی کا جائزہ لیا جائے تو اس میں جہاں کافر قوموں کے ساتھ دو درجن سے زیادہ جنگیں موجود ہیں وہاں معاہدات بھی تاریخ

کا حصہ ہیں، مل جل کر رہنے کی روایت بھی میثاق مدینہ کی صورت میں واضح دکھائی دیتی ہے، اور داخلی دشمنوں کو صف آرائی کا موقع نہ دیتے ہوئے آہستہ آہستہ انہیں بے اثر کر دینے کی کامیاب حکمتِ عملی کے ثمرات بھی نظر آتے ہیں۔